زرگاؤں کی رانی

ایک رانی کی کہانی جو حکمراں بھی تھی اور محبت کی آگ سے شعلہ فشاں بھی

کرشن چندر

انتخاب: نازیہ کنول نازی

"پیش لفظ"

ابتداء اللہ رب العزت کے پاک اور بابرکت نام سے جو بڑا مہربان رحم کرنے والا ہے۔

عزیز دوستو!

''رومیل ھاؤس آف پبلی کیشنز'' وہ خوبصورت معیاری ادارہ ہے جس نے ہمیشہ سیدھے سادھے لفظوں کو انتہائی خوبصورت پیرھن عطا کر کے آپ کے ذوق کی ادبی پیاس کو خوشبودار میٹھا شربت، اپنی ادبی تخلیقات کی صورت عطا کرنے میں بے مثال کردار ادا کیا۔

یہ تخلیقات ادبی، افسانوی ہوں یا شعری، رومیل ھاؤس آف پبلی کیشنز نے اپنے میعار پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا، بات ''اک بار کہو تم میری ہو'' کی کریں یا ''تم نے دیکھی نہیں جدائی ابھی'' کی، اس ادارے کی کہنہ مشقی، نائمل سے لے کر کاغذ، کمپوزنگ، پرنٹنگ، اور سب سے بڑھ کر بہترین، معیاری مواد سے اپنی ہر کتاب میں صاف دیکھی جاسکتی ہے۔

میں جناب ارشد ملک صاحب کی بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے میرے ادبی کام کو سراہتے ہوئے نہ صرف اپنی کتاب ''اک بار کہو تم میری ہو'' کا انتخاب میرے نام کیا، بلکہ میری خواہش اور خوشی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے ''زرگاؤں کی رانی'' کے عنوان سے یہ کتاب جو اردو ادب کے نامور مصنف کرشن چندر صاحب کی بے مثال کاوش ہے کو انتخاب

کی صورت آپ تک پہنچانے کا موقع بھی فراہم کیا۔

''زرگاؤں کی رانی'' میں محبت کی آبلہ پائی کے سفر کی روداد پڑھتے ہوئے یقیناً آپ رومیل ھاؤس آف پبلی کیشنز کی اس تازہ کاوش کو بھی ضرور سراہیں گے۔ اس کتاب پر آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

دُعاؤں میں یاد رکھیئے گا۔

(خیر اندیش)

نازیہ کنول نازی

خوشبو رائٹرز اکیڈمی

تحصیل ھارون آباد ضلع بہاول نگر

زرگاؤں کی رانی

دوپہر کا کھانا کھا کے میں آرام کرنے کی نیت سے بستر پر لیٹا ہی تھا کہ میرا اردلی چارلی دروازے ہی سے یہ کہتا ہوا اندر آیا، جلدی چلیے حضور! گڑھی سے آدمی آیا ہے، رانی صاحبہ سخت بیمار ہیں۔

آرام میں خلل پڑنے سے میں منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا اُٹھا۔ کیوں کہ مجھے دوپہر میں قیلولہ کرنے کی عادت ہے، اور جب اس میں کھنڈت پڑ جائے تو مجھے سخت اکھرتا ہے، ریاستوں کے خاتمے کے بعد آج بھی زرگاؤں کے علاقے میں رانی صاحبہ کی ایک طرح سے پوجا ہوتی ہے۔ گڑھی کی مالکن کا حکم کوئی نہیں ٹالتا۔ حالاں کہ مجھے اُس علاقے میں تعینات ہوئے صرف پانچ روز ہوئے تھے، لیکن اتنا تو میں نے اس عرصے میں معلوم کر لیا تھا۔ جتنے عرصے میں مَیں نے کپڑے بدلے اور بیگ سنبھالا،

اتنے عرصے میں چارلی میرا گھوڑا دوڑاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

زرگاؤں کا علاقہ پہاڑی ہے، لوگ اُکھڑ، خوب صورت اور بدمزاج ہیں۔ اس علاقے میں ابھی تک کوئی موٹر روڈ نہیں بنی ہے، گہری کھائیوں، کھڈوں اور وادیوں والی زمین ایسی سنگلاخ ہے کہ اُسے آسانی سے فصل پیدا کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ لوگ زیادہ تر فوج میں بھرتی ہوتے ہیں، اور خاندانی دشمنی نسل بہ نسل یاد رکھتے ہیں۔

میں گھوڑے کو مہمیز دے کر آگے بڑھا ہی جا رہا تھا، ایک اونچے پہاڑی ٹیلے پر، جہاں گڑھی کی سرخ فصیلیں اخروٹ کے گھنے درختوں میں چھپتی ہوئی دھوپ میں چمکتی ہوئی قریب آتی جاتی تھیں۔ مجھے اپنے بنگلے سے گڑھی کے پھاٹک تک پہنچنے میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے۔ پھاٹک پر دو چوب دار بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے ہمیں آتے دیکھ کر گڑھی کے آہنی کُنڈوں والے اور شیر اور مور کی چوبی تصویروں والے بڑے بڑے پھاٹک کھول دیے اور ہم اترے بغیر اپنے گھوڑے دوڑاتے ہوئے اندر چلے گئے۔

ایک محراب دار نیم تاریک ڈیوڑھی سے گزر کر ہم گڑھی کے وسیع صحن میں پہنچ گئے، جہاں دھوپ تھی اور آسمان کھلا نظر آ رہا تھا، اور پھول دار پیڑوں کی قطاریں تربیت یافتہ سنتریوں کی طرح کھڑی تھیں، اور روشوں کے اردگرد چوکور قطعوں میں گھاس ایسی گہری، سبز، دبیز، لہراتی اور اِتراتی تھی جیسے زرگاؤں کی گڑھی کا خاندان تھا، جو اس

گڑھی میں اور آس پاس کے علاقے میں گذشتہ بارہ سَو برس سے حکومت کرتا چلا آیا تھا۔ ایسی گھاس شہروں میں نہیں اُگتی۔ محض سائنس اور کھاد کی مدد سے نہیں اگائی جا سکتی۔ ایسی گھاس کے لیے بارہ سَو سال کا تسلسل بھی ضروری ہے۔

ایک ملازم نے دوڑ کر میری رکاب پکڑ لی۔ میں گھوڑے سے اتر آیا اور صحن کی روشوں پر چلتا ہوا سرخ پتھروں سے بنی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کے باغ میں پہنچا جہاں شاہ بلوط کے گھنے پیڑ تھے، اور اخروٹ کے چھدرے پیڑ تھے، اور تنگ انگور کی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں، اور اُن کے پس منظر میں ہمالیہ کی اونچی چوٹیاں برف کے فرغل پہنے نظر آ رہی تھیں۔ اُن مغرور حسیناؤں کی طرح، جو سج سنور کر کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہوں، مگر آپ دیکھنے سے احتراز کر رہی ہوں۔

منظر اتنا خوبصورت تھا کہ میں چلتے چلتے رک گیا۔ چند لمحے بعد میرے ساتھ آنے والے ملازم نے مجھے ایک شریفانہ ٹہوکا دیا۔ اور میں چونک کر اُس کے ساتھ ساتھ آگے چلنے لگا۔ پرانے چھتے ہوئے منقش محرابوں والے ایک دالان سے گزر کر ہم ایک زنانہ ڈیوڑھی میں پہنچے، یہاں ایک مؤدب خادمہ نے خاموشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ساتھ آنے والے دونوں ملازم ڈیوڑھی کے باہر ہی رہ گئے تھے، اور اب میرا بیگ خادمہ نے سنبھال لیا تھا۔ وہ تیز اور بے آواز قدموں سے ایک لمبی غلام گردش میں چلتی ہوئی مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گئی۔ غلام گردش کا غالیچہ بہت ہی پرانا اور قیمتی معلوم ہوتا تھا۔ دوروپہ کاٹھ کی نازک بہت را چپوتی محرابوں پر زربفت کے پردے

جھول رہے تھے، اور اُن پر کہیں کہیں کانسی، سیاہ سنگِ مرمر، پیتل اور اخروٹ کی لکڑی کے پرانے اور پُر اَسرار بت ایستادہ تھے۔ چھت زیادہ اونچی نہ تھی، اور اُس سے پرانی وضع کے پرانی پرتگیزی لالٹینوں والے فانوس لٹک رہے تھے۔ پوری فضا میں اگربتی، دھوپ اور لوبان کی مہک چھائی ہوئی تھی، جو نہ جانے کیوں اپنی خوشبو کے باوجود میرے ذہن میں بیزاری کیفیت پیدا کرنے لگی۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، اندر ہی اندر اپنے ماحول سے الجھتا گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا، ایسا کیوں ہے۔ ممکن ہے، اِس کی وجہ یہ ہو کہ میرے شہری اور سائنسی تربیت یافتہ ذہن پر یہ ماحول گراں گزر رہا تھا۔

خادمہ پوری غلام گردش گھوم کر مجھے بائیں طرف ایک بند دروازے کے سامنے لے گئی، جس پر شیر اور مور کی چوبی تصویریں ابھری ہوئی تھیں، اور اُن کے گرد کی زمین کا روغن سرخ رنگ کا تھا، اور سبز دروازے کے دونوں طرف اعلیٰ قسم کے چینی جیڈ کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ خادمہ نے بند دروازے تک پہنچ کر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا، اور جب میں نے اُسے اپنے آگے چلنے کا اشارہ کیا تو وہ جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی، اور خاموشی سے نگاہیں جھکا کر اُس نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اکیلے ہی اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میں جیڈ کی جھالروں کی لڑیاں سرکا کے اور دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ چاندی کے پایوں والے ایک اونچے چھپر کھٹ نما بستر پر نیم دراز تھی۔ تکیوں نے اُس کا سر اُٹھا رکھا تھا، اُس کا چہرہ گول اور بوڑھا تھا۔ وہ سبزی مائل آنکھیں بڑے

تجسس سے مجھے دیکھ رہی تھیں، کیونکہ گڑھی کے اندر آنے کا، اور گڑھی کی مالکن سے ملنے کا، میرا یہ پہلا موقع تھا۔ اِس لیے میں اُسے اور وہ مجھے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک تھی، اور گال بخار کی حدت، یا کسی اندرونی کھولن سے تمتمائے ہوئے تھے، اور سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ وہ شدید علیل دکھائی دیتی تھی، مگر اس علالت میں بھی وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔

''ڈاکٹر گھوش؟.....'' مریضہ نے تحکمانہ لہجے میں مجھ سے پوچھا، اور جب میں نے ذرا سا جھک کر اثباتی انداز میں سر ہلایا تو اس نے مسکرا کر مجھے بستر کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

''کہاں تھے تم؟ میں گزشتہ چار دن سے تمہارے لیے اپنا آدمی بھیج رہی ہوں۔'' اُس کی آواز میں ایسا غلغلہ تھا جیسے میں اُس کا زرخرید غلام ہوں۔ یہ لوگ آزادی کے بعد بھی اپنی عادتیں نہیں سدھار سکے۔ بارہ سو سال پرانی عادت ہے، کیسے بدلے گی! کہنہ ہو کے ختم ہو جائے گی، یا ختم کر دی جائے گی، مگر اس کا بدلنا مشکل ہے۔

مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر ہی اندر غصہ بڑھ رہا ہے، مگر اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے میں نے بے حد مؤدب لہجے میں کہا، ''رانی صاحبہ! میں دورے پر تھا۔''

''پہاڑی علاقے کے ڈاکٹر کو آتے ہی سب سے پہلے اپنے علاقے کی حدود اور اُس کے مریضانہ مسائل کا مطالعہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ تم کو سب سے پہلے میرے پاس آنا چاہیے تھا۔ آج تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ میں زرگاؤں کی رانی ہوں۔

ریاست نہیں رہی تو کیا شرافت بھی ختم ہوگئی؟'' اُس کے لہجے میں ایک تیز اور تند شکایت تھی، جس کی نوک بڑی بے رحم تھی، مگر میں نے اُسے بھی نظر انداز کر دیا، اور ہمدردی بھرے لہجے میں کہا، ''مجھے بہت افسوس ہے! واقعی، شدید افسوس ہے! بتایئے، آپ کو کیا تکلیف ہے؟''

''میں مر رہی ہوں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' میں نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے اُس سے پوچھا۔ ''آپ اس درجہ علیل تو دکھائی نہیں دیتیں!''

''ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے، تمہارا معائنہ یہ بھی ظاہر کرے مجھے کوئی خطرناک بیماری نہیں ہے، مگر میں جانتی ہوں کہ میں مر رہی ہوں، اور دنیا کا کوئی قابل سے قابل ڈاکٹر بھی مجھے نہیں بچا سکتا۔''

اُس کی آواز میں شدید قطعیت تھی۔ میری حیرانی بڑھتی گئی۔ وہ میری سوالیہ خاموشی سمجھ کر بولی، ''تم اپنے دل میں جو سوچتے ہو، ٹھیک سوچتے ہو کہ جب میں واقعی مر رہی ہوں تو تمہیں بلانے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ تمہارا سوال اپنی جگہ بالکل درست ہے، مگر میں نے تمہیں علاج کے لیے نہیں بلایا ہے۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں، وہ باتیں، جو میں کسی اجنبی سے کہہ سکتی ہوں، اور تم میرے لیے مکمل اجنبی ہو۔ کرسی میرے نزدیک کھسکا لو، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ دیکھیے میں ڈاکٹر ہوں،

میں معلوم کرنا چاہتا ہوں، آپ کو بیماری کیا ہے؟ آپ کیوں مرنے کی باتیں کر رہی ہیں؟''

''تم اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔'' رانی نے مجھے معائنہ کرنے کی اجازت دے دی۔

مریضہ کی نبض بہت تیز تھی۔ اُسے ایک سو پانچ ڈگری کا بخار تھا، اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی، اور آنکھوں میں ایک وحشت ناک چمک تھی، اور خون کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔ مجھے تو اُس کی دماغی حالت بھی ٹھیک نہیں معلوم ہوتی تھی..... سب ملا کر حالت واقعی خطرناک تھی۔ میں نے مریضہ کے احتجاج کے باوجود اُسے فوراً انجکشن لگایا، اور دوا پلائی، اور دوسری طبّی تدابیر اختیار کرنے پر زور دیا۔ وہ ''ہوں، ہاں'' کرتی رہی۔ اُس کے چہرے سے یوں لگتا تھا جیسے وہ میری ان حماقتوں سے سخت عاجز ہے، اور محض مجھے بہلانے کے لیے میری ہاں میں ہاں ملا رہی ہے۔

یکا یک اُس نے مجھے آستین سے کھینچ کر کرسی پر بٹھا لیا، اور ایک تیز وحشیانہ سرگوشی میں بولی، ''بیٹھ جاؤ، اور سن لو، جلدی سن لو..... وہ، جسے سنانے کے لیے میری جان میرے حلق میں اٹکی ہوئی ہے۔''

میں نے مجبور ہو کر اپنی ہتھیلیاں گود میں رکھ لیں اور ہمہ تن گوش ہوگیا۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود اُٹھ کر اور تکیوں کا سہارا لے کر بستر پر بیٹھ گئی۔ یکا یک اُس کی نگاہ میرے سر پر سے گزر گئی اور دور پیچھے جا کر کہیں رک گئی، پھر اس کے بدن میں

ایک جھرجھری سی آئی اور اُس کی آنکھوں کی وحشت بڑھ گئی۔ میں نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔

میرے پیچھے دائیں طرف کوئی تیس گز کے فاصلے پر اس خواب گاہ میں سے ایک دروازہ ایک ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا۔ دروازہ آدھا کھلا تھا، آدھا بند تھا۔ اَدھ کھلے دروازے پر ایک پردہ بس اتنا ہٹا ہوا تھا کہ اُس سے ملحقہ ڈرائنگ روم کا ایک گوشہ نظر آ رہا تھا۔ ایک قیمتی قالین، ایک تپائی اور دیوار پر ایک تصویر، ایک باوقار وجیہہ مرد کی تصویر، جو جودھ پوری برجس پہنے ہوئے، ہاتھ میں ایک بندوق لیے کھڑا تھا۔

''وقت کیا ہے؟'' مریضہ نے کانپ کر مجھ سے پوچھا۔ میں نے گھڑی دیکھ کر بتایا، ''چار بجے ہیں۔''

وہ ہانپ کر بولی، ''ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔'' اُس نے ایسے مایوس اور ناامید لہجے میں یہ کہا کہ میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

''دو گھنٹے؟.....کاہے کے لیے؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ اُس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی، ''وہ تصویر، جو تم نے ابھی دیکھی ہے، جواب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے، کنور راج بہادر سنگھ کی ہے۔''

چند لمحوں کے لیے رانی نے میری طرف سے منہ پھیر کر بائیں جانب کی کھڑکی میں دیکھا جو ایک ڈھلوان باغ میں کھلتی تھی۔ باغ میں فوارے تھے، اور وہ شریر بچے کی

طرح دھومیں مچا رہے تھے، اور سورج کی روشنی میں کھلکھلا کر ہنستے تھے۔ اُس کمرے سے باہر دنیا بے حد جوان تھی.....

میں نے رانی کی نگاہیں دیکھ کر اندازہ لگایا کہ رانی اس وقت اپنی خواب گاہ سے باہر کہیں دور جا چکی ہے۔ یکا یک ایک گہری آہ اُس کے ہونٹوں سے نکلی، اور وہ یادوں میں ڈوبی آواز میں کہنے لگی، ''اُن دنوں دنیا بہت جوان تھی۔ اسے ایٹم بم نے بوڑھا نہیں کر دیا تھا، اُن دنوں گیہوں رُپے کا تیس سیر بکتا تھا، لوگ عورتوں سے عشق کرتے تھے، راشن کارڈ سے نہیں۔ اُن دنوں پھول کھلتے تھے، پات ہرے تھے، دل جوان تھا۔ ہَوا میں ایک نیا پن تھا۔ اب تو ہَوا ابھی بوڑھی ہو چلی ہے، سسکیاں لے کر کراہتی ہوئی چلتی ہے۔

''اُن دنوں میں بھی جوان تھی۔ تم نے تو مجھے اُن دنوں میں نہیں دیکھا تھا۔ اُن دنوں میں ایسی نہ تھی۔ یہ چندر بدن، جو اَب دھواں دھواں سا ہو رہا ہے۔ اُن دنوں چنبیلی کے پھول کی طرح سبک اور حسین تھا۔ سارے جہاں میں زرگاؤں کی راج کماریوں، یعنی میری اور اُرملا کی دھوم تھی۔ اُرملا، میری چھوٹی بہن تھی، اور مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹی تھی، اور دگنی حسین تھی مجھ سے۔ میں اور اُرملا جدھر سے گزر جاتے تھے، ٹھنڈی سانسوں کا ایک غبار پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ ہائے، کیسے دن تھے وہ، جب اپنا پسینا سونگھ کر نشہ ہو جاتا تھا! آج کی عورتیں جوان نہیں ہوتیں، جوان ہونے سے پہلے ہی بوڑھی ہو جاتی ہیں، بوڑھی ہونے سے پہلے نوکری کر لیتی ہیں، اور اپنے شوہر سے زیادہ

اپنے پراویڈنٹ فنڈ کا خیال کرتی ہیں۔ یہ عورتیں بھلا عشق کریں گی؟ عشق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دل کے پات ہرے ہوں..... پر جب پیدا ہونے سے پہلے ہی پتے مرجھا جائیں، اور پھول کھلا جائیں تو عشق کون کرے!''

ایک لمحے کے لیے رانی کے لہجے اور چہرے پر تیزی، تلخی اور تندی کی ایک گہری چمک پیدا ہوئی، پھر اگلے چند لمحوں میں دھیرے دھیرے بجھ گئی، اور ایک میٹھی سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر بکھر گئی۔

''پھر بھی یہ بات میں مان لوں گی کہ کوئی بھی عہد ہو، کوئی بھی زمانہ ہو، کوئی بھی ملک ہو، عشق تو عورت ہی کرتی ہے۔ مرد زیادہ سے زیادہ چاہ سکتا ہے، مگر عشق عورت ہی کرتی ہے، کیوں کہ مرد جسم ہے اور عورت روح..... اس لیے اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم نے عورت ہو کے اس دنیا میں کیا کیا، حالاں کہ میں بہت سے کام گنا سکتی ہوں؛ میں نے زرگاؤ کے علاقے پر حکومت کی، جس طرح بارہ سَو سال سے میرے آباؤ اجداد کرتے آئے تھے، پر جب آزادی آئی تو میں اِسی علاقے سے پارلیمنٹ کی ممبر چن لی گئی، اور پھر اس علاقے پر میں دوسرے طریقے سے حکومت کرنے لگی۔ میں نے رفاہِ عام کے بہت سے کام کیے۔ اب تک پچاس لڑکیوں کی شادی اپنے خرچ سے کر چکی ہوں، میں نے مندر بنوائے، اور تالاب، اور ہر سال اپنے خاوند کی برسی پر پانچ سو براہمنوں کو کھانا کھلاتی ہوں۔ بدری نارائن سے کنیا کماری تک میں تمام تیرتھوں کی یاترا کر چکی ہوں، اور زرگاؤں کے علاقے کی ہر آبادی میں ہر سال، اپنے خرچ پر سینکڑوں

پیسے گنگا جل کے منگا کے مفت تقسیم کرتی ہوں، کیوں کہ اِس سخت کوش اور سخت گیر سنگلاخ پہاڑی علاقے میں گنگا جل کا ملنا ناممکن ہے، اور گنگا جل منہ میں ٹپکائے بغیر کوئی ہندو کیسے شانتی سے مر سکتا ہے، میں نے دس آدم خور چیتے مارے ہیں، اور شاید میں ہندوستان کی اور غالباً دنیا کی پہلی عورت ہوں، جس نے اپنے ہاتھ سے اتنے آدم خور چیتے شکار کیے ہیں۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ آج تک کوئی جنگلی جانور، خوں خوار جانور میری رائفل کی زد میں آیا ہو، اور جان بچا کر چلا گیا ہو۔ میں نے گیتا کی تفسیر لکھی ہے، اور مجھے ''چھایا وادی کویتا'' سے بہت لگاؤ ہے۔ ہر سال اپنی گڑھی میں ایک شاندار کوی سمیلن کرتی ہوں، جس میں صرف چھایا وادی شاعروں کو مدعو کرتی ہوں۔ یہ سب کچھ میں نے کیا ہے، لیکن کوئی اگر مجھ سے پوچھے کہ تم نے اپنی زندگی میں کیا کیا ہے؟..... تو میں یہی کہوں گی، میں نے عشق کیا ہے، اور ٹوٹ کر کیا ہے۔''

وہ چپ ہو گئی..... میں مزکر کنور راج بہادر سنگھ کی تصویر کو دیکھنے لگا جو چاندی کے فریم میں لگی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے تصویر آدھی پردے کی اوٹ میں تھی، اور آدھی نظر آ رہی تھی، پھر بھی جو کچھ نظر آ رہا تھا، اسے دیکھتے ہوئے یہ آسانی سے باور کیا جا سکتا تھا کہ کنور راج بہادر سے کسی نے ایسی ہی محبت کی ہو گی۔ میں نے ایسی وجیہہ شبیہہ بہت کم دیکھی ہے۔

''میں نے اُسے کالڑا کے گھنے جنگلوں میں پہلی بار دیکھا۔ کالڑا کے جنگل زرگاؤں کے علاقے اور ہرگاؤں کے علاقے کے عین درمیان میں واقع ہیں اور دونوں

ریاستوں کے بیچ میں ایک طرح کی سرحد کا کام دیتے ہیں۔ اِن جنگلوں میں کاشت نہیں ہوسکتی، درخت نہیں کاٹے جاسکتے، اور کوئی آبادی نہیں بسائی جاسکتی۔ یہ جنگل صرف شکار کے لیے محفوظ کر دیے گئے ہیں، اور اِن میں صرف ہر زرگاؤں کے تعلقے اور زرگاؤں کی ریاست کے شاہی خاندان کے افراد شکار کھیل سکتے ہیں۔

''انہی جنگلوں میں پہلی بار میں کنور راج سے ملی۔ وہ شاید اپنے ساتھیوں سے کٹ گیا تھا، اور اُس کی رائفل جام ہوگئی تھی۔ میں نے دیکھا، دو دفعہ 'کلک کلک' کی آواز آئی، مگر رائفل نہیں چلی، اور مغرور چیتا کنور راج پر جست لگانے کے لیے اپنے پچھلے پنجوں پر بیٹھ گیا۔ بس، چند لمحوں کا معاملہ تھا، وہ جست لے کر ہوا میں اُڑے گا اور کنور راج کو اپنے پنجوں میں دبوچ لے گا۔ میں کھڑی دیکھ رہی تھی، اور ایک ایسی جگہ پر کھڑی تھی کہ میں اپنی رائفل کے ایک ہی وار سے چیتے کو ختم کرسکتی تھی، مگر میں وہیں کی وہیں کھڑی رہی۔ کنور راج نے ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں مجھے کھڑا دیکھا، اور ہم دو اجنبیوں کی آنکھیں پہلی بار چار ہوئیں۔ وہ پھر چیتے کی طرف دیکھنے لگا، اور جب چیتے نے جست لگائی تو کنور راج اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا، چیتے کا وار خالی گیا۔ چشمِ زدن میں کنور راج نے اپنی رائفل اُلٹی پکڑ لی تھی، اور اب وہ اپنی رائفل کے کندے سے چیتے پر پل پڑا۔ بڑی شاندار لڑائی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دو چیتے لڑ رہے ہیں، اور میرے لئے لڑ رہے ہیں، اور میں وہاں کھڑی مبہوت تک رہی تھی۔ کنور راج کی چھاتی اور بایاں بازو اور پیٹھ کا ایک حصہ لہولہان ہو چکا تھا، مگر وہ دلیری، ہوشیاری اور حیرت انگیز جی داری

سے لڑ رہا تھا۔ اِس لڑائی کے دوران کئی بار میری اور اُس کی آنکھیں ملیں، نظریں چار ہوئیں۔ میں ایک لمحے میں اُس لڑائی کا فیصلہ کرسکتی تھی، مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اگر کنور راج کی نگاہوں میں ایک سوال تھا، تو میری نگاہوں میں اُس کا جواب بھی تھا۔

''آخری بار ایسی تیزی سے، جس پر چیتا بھی رشک کرے، کنور راج نے حملہ کرنے والے چیتے کے نیچے سے پھسل کر ایک پہلوان کی طرح اُسے چت کر دیا، پھر دونوں ہاتھوں میں رائفل پکڑ کر اٹھتے ہی چیتے کی کھوپڑی پر ایسا بھرپور وار کیا کہ کھوپڑی کے دو ٹکڑے ہوگئے، اور چیتے کا بھیجا اُس کے سر کے بالوں سے بہہ نکلا۔ ایک آخری غراہٹ کے ساتھ چیتا ختم ہوگیا۔ کنور راج چند لمحوں تک ہانپتا کانپتا، ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا، پھر وہیں چیتے پر گر کر بے ہوش ہوگیا۔

''میں اُسے جنگل سے اُٹھا کر گڑھی لے آئی۔ آناً فاناً اُس کے خطرناک طور پر زخمی ہونے کی خبر دونوں تعلقوں میں پھیل گئی۔ کنور راج ہر گاؤں کے تعلقے کا مالک تھا، اور میں زرگاؤں کی رانی تھی۔ دونوں تعلقوں سے رعایا اُس کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ٹوٹ پڑی، مگر ڈاکٹروں کے مشورے کی بناء پر میں نے اُسے کسی سے ملنے نہ دیا۔

''دس دن تک وہ زندگی اور موت کے درمیان لٹکتا رہا۔ اُس نے شدید زخم کھائے تھے، بائیں کندھے پر، اور دل کے قریب ذرا اوپر پسلیوں پر..... اگر چیتے کا پنجہ ذرا نیچے پڑ جاتا تو کنور راج کا خاتمہ یقینی تھا۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا، اُس کے سینے پر زخم کے نشان تھے، اور جانگھ پر بھی۔ وہ زخموں سے پٹا پڑا تھا، اور پہلے دس روز تک تو

ڈاکٹر بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ اِن زخموں سے جاں بر ہو سکے گا کہ نہیں۔ مگر میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ زندہ رہے گا۔ اُسے میری خاطر زندہ رہنا ہی پڑے گا۔ اُس نے چیتے ہی کو شکست نہیں دی تھی، اُس نے مجھے بھی شکست دی تھی۔ فرق اتنا ہے کہ جب مرد شکست کھاتے ہیں تو صلح کرتے ہیں، جب عورت ہارتی ہے تو اپنے آپ کو مکمّل طور پر سپرد کر دیتی ہے۔

اُن دس دنوں میں مَیں نے دن رات ایک کر کے اُس کی تیمارداری کی۔ میں دن میں جاگی، اور رات میں جاگی اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی ایک پلک بھی جھپکی ہو، کیوں کہ یہ اب میری لڑائی تھی۔۔۔ موت کے ساتھ، اور مجھے یہ لڑائی بہر صورت جیتنی تھی۔ حالاں کہ نرسیں تھیں، ڈاکٹر تھے، اور علاج معالجے کا بہترین انتظام تھا، مگر یہ میری لڑائی تھی، اِس لیے میں چوبیس گھنٹے مریض کی پٹی سے لگی رہتی تھی اور پلک تک نہ جھپکتی تھی۔۔۔ تمہیں تو زندہ رہنا ہی ہے میری خاطر کنور راج! اُرملا، میری چھوٹی بہن، بار بار میرے پاس آتی تھی، اور مجھ سے آرام کرنے کے لیے کیسی کیسی ضد کرتی تھی۔ اُرملا میری بہت چہیتی ہے، اور میں اُس کی کوئی بات ٹال نہیں سکتی تھی۔ تھکن اور نیند سے میرا سارا جسم ٹوٹ رہا تھا، لیکن میں پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ اگر میں ایک لمحے کے لیے بھی کنور راج کے بستر سے ہٹی تو موت کا چیتا اُسے کھا جائے گا۔

دسویں دن صبح کے وقت، میں کہہ نہیں سکتی، کب اچانک میری آنکھ لگ گئی، اور میں اُس کے بستر کے قریب آرام دہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی، پہلی نیم غنودگی میں مجھے

ایسا لگا جیسے دھیرے قدموں سے اُرملا میرے پاس آ گئی ہو، اور پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہو۔۔۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں رہا، کچھ معلوم نہیں، میں کب تک سوئی۔

اتنا یاد ہے، جب جاگی، دن ڈوب چلا تھا، شام ہو رہی تھی۔ خادماؤں نے کمرے کے لیمپ روشن کر دیے تھے، اور اُن کی جھلملاتی ہوئی سنہری روشنی میں جب پہلی بار میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ کنور راج کو ہوش آ گیا ہے، اور اُرملا، میری چھوٹی اور چہیتی بہن، کنور راج پر جھکی ہوئی چاندی کے چمچے سے اُس کے مُنہ میں سنگترے کا راس ڈال رہی ہے، اور بار بار جھکنے کی وجہ سے اُس کے شانوں تک کٹے ہوئے بال کنور راج کے رخساروں پر یوں جھک جاتے ہیں جیسے ترسی ہوئی چوٹیوں پر برسات کے کالے اور گہرے بادل۔

کنور راج بہت مضمحل اور کمزور دکھائی دیتا تھا، مگر اُرملا کی دل نواز مسکراہٹ کو اپنے چہرے کے اِس قدر قریب دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں بھی ایک دل نواز کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ ایک بچے کی طرح ہونٹ کھولے اُرملا کے ہاتھوں سے رس پی رہا تھا، اور جس وارفتگی سے اُرملا کو دیکھ رہا تھا، میں اُسے ایک ہی نگاہ میں پہچان گئی۔۔۔ میں لڑائی ہار گئی، اُرملا نے شب خوں مارا تھا۔

میں یہ نہیں کہتی، اُس نے دیدہ و دانستہ ایسے کیا تھا۔ شاید مجھے سوتا دیکھ کر اُس نے مجھے خوش کرنے کے لیے کنور راج کی تیمارداری سنبھال لی تھی، شاید اس دن کنور راج کو ہوش میں آنا تھا۔ میں جو مسلسل نو روز سے جاگ رہی تھی، شاید اس دن میری نیند

کو آنا تھا، اور ہونی کو ہونا تھا۔۔۔کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ اتنا ضرور جانتی ہوں کہ جب میں نے آنکھ کھولی، اور اُرملا اور کنور راج کو آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھا تو ایسا لگا جیسے ان دونوں کی جان پہچان چند گھنٹوں سے نہیں، برسوں سے ہے، صدیوں سے ہے۔۔۔شاید ہمیشہ سے ہے۔ دل میں ایک خنجر سا اترتا محسوس ہوا، مگر میں ضبط کر گئی میں نے اپنے زخموں سے رِستا ہوا لہو آپ ہی پی لیا، ہونٹ سی لیے، اور یوں ظاہر کیا جیسے میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔

''اُس دن سے میں آپ ہی آپ اُس سے پیچھے ہٹتی چلی گئی، اور اُرملا آگے بڑھتی چلی گئی۔ ابھی کچھ ہوا نہ تھا، میں نے ایک لفظ محبت کا نہیں کہا تھا۔ دس دن تک، جب تک وہ بے ہوش رہا، میں جیسے اُسے اپنی گود میں لیے بیٹھی رہی، اور دل ہی دل میں مَیں نے اپنا سب کچھ اُس پر نچھاور کر دیا۔ وہ کیسے سمجھ سکتا تھا! اُرملا بھی کیسے جان سکتی تھی، کیوں کہ ابھی کچھ ہوا نہ تھا، ابھی ایک لفظ جان پہچان، یا واقفیت کا، ایک نگاہ، یا ایک تبسم تک ہمارے درمیان مشترک نہ ہوا تھا۔۔۔یہ کہ میں نے اُسے اپنے دل میں جگہ دی تھی، اِس کا علم صرف مجھے تھا، یا میرے دل کو۔

مگر صرف میرے قدم ہی پیچھے ہٹے تھے، میری محبت پیچھے نہیں ہٹی تھی۔ میں پیچھے ہٹنے والی عورتوں میں سے نہیں ہوں۔ اکثر لوگ یا تو جھک جاتے ہیں یا ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں نہ جھک سکتی ہوں، نہ ٹوٹ سکتی ہوں، میں صرف مَر سکتی ہوں۔

تم مجھے نہیں جانتے، میں نے آج تک ہار نہیں مانی، مگر اُرملا تو میری سگی بہن تھی،

میری اپنی چہیتی۔ میں اُس سے کیا کہہ سکتی تھی! تم نے اُرملا کو نہیں دیکھا، اگر دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے۔ کوئی اُس سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔۔۔ایسی بھولی، ایسی معصوم، ایسی پیاری، ایسی نازک، ایسی سبک، جیسے اُس کا جسم نسیم سحری سے تراشا گیا ہو۔ اُسے کوئی کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتی تھی، اتنا مجھ سے ڈرتی تھی کہ ممکن ہے، میں اُس سے کچھ کہتی تو وہ وہیں سہم جاتی، اُس کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو نکل پڑتے، یا وہ وہیں، میرے سامنے کھڑے کھڑے اپنے احساسِ جرم کی وحشت سے مر جاتی۔ زندگی میں اُسے پیار ہی پیار ملا تھا۔ اُس کے مرحوم ماں باپ نے، پھر اُن کے بعد اُس کی بڑی بہن نے اُسے صرف پیار دیا تھا، اور وہ بھی اس لائق تھی کہ کوئی اُس سے پیار کرے، یا وہ کسی سے پیار کرے۔ وہ نہ میری طرح حکومت کرنے کے لیے بنائی گئی تھی نہ شکار کھیلنے کے لیے، نہ پارلیمنٹ کا ممبر بننے کے لیے، نہ کسی رعب، جاہ، طنطنے کے لیے۔۔۔وہ صرف پیار کرنے کے لیے بنائی گئی تھی، اِس لیے میں نے خود کو ہٹا لیا، مگر مکمل طور پر ہٹا نہ سکی، میں بھی اُس کی تیمارداری میں لگی رہی اور اُرملا بھی، پھر دھیرے دھیرے بالکل غیر محسوس انداز میں یوں ہوا، جیسے اُرملا کے پاس زیادہ وقت ہے اُسے دینے کے لیے، اور میں ریاست کے کام دھندوں میں مصروف ہوں۔ اب میں اُس کے پاس بیٹھی تھی مگر محض اپنا دل جلانے کے لیے، اپنے شعبے بڑھانے کے لئے، اپنے زخموں پر نمک لگانے کے لیے، اس جلنے، تپنے، کڑھنے میں بھی ایک مزہ ہے۔ اس لذت کو وہی جانتا ہے جس نے کبھی اپنے محبت کے زخموں کو خود چھیڑا ہو۔

میں چھپ چھپ کر اُن کی باتیں سنا کرتی تھی۔ ایک دن کنور راج اُرملا سے پوچھ رہا تھا، ''تم کہتی تھیں کہ رانی جی نے دن رات جاگ کر میری دلی تیمارداری کی اور اُس وقت کسی دوسرے کو میرے قریب نہ آنے دیتی تھیں۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔' اُرملا نے جواب دیا۔

''تو اب وہ مجھ سے اتنا دور دور کیوں رہتی ہیں؟'

''ریاست کے کام ہوتے ہیں۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔' کنور راج نے سر جھکا لیا، پھر سوچ سوچ کر بولا، 'مگر تمھاری بہن بڑی سنجیدہ رہتی ہیں۔'

''ہاں سنجیدہ تو ہیں، کیوں کہ ریاست کا کام وہی تو دیکھتی ہیں۔ اُرملا بولی، 'مجھے تو سمجھ میں آتا ہی نہیں، میں تو کچھ کر ہی نہیں سکتی، سبھی کچھ بہن کرتی ہیں۔'' کیا اُن کی زندگی میں آج تک کوئی مرد نہیں آیا؟'

میں نے تو دیکھا نہیں۔'

''شاید وہ محبت نہیں کر سکتیں۔۔۔' کنور راج اُرملا کا ہاتھ دیکھتے ہوئے بولا۔ اُن کی شخصیت میں وقار اور دبدبہ زیادہ ہے۔ ان کی عزت کی جا سکتی ہے، ان سے محبت نہیں کی جا سکتی۔

واہ! تم کیسی باتیں کرتے ہو؟ میں تو ان سے محبت کرتی ہوں۔ اُرملا نے احتجاج کیا۔

''مجھ سے بھی زیادہ؟' کنور راج نے پوچھا۔

''تمھاری بات اور ہے۔ اُرملا کی آنکھیں جھک گئیں،

اور بڑے کمزور لہجے میں بولی۔

''کنور راج نے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے اپنی انگلی رکھ کر اُس کا چہرہ اتنا اونچا کیا کہ اُرملا کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں لے لیا، اور بڑے غور سے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا، تمھاری آنکھوں سے مجھے ڈر نہیں لگتا،

تمھاری آنکھیں ایسی ہیں جیسے جھیل میں نیل کمل کھلے ہوں، مگر تمھاری بڑی بہن کی آنکھوں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔۔۔ دو گہری سبز آنکھیں، کسی چیتے کی آنکھیں معلوم ہوتی ہیں۔

''میں اس سے زیادہ نہ سن سکی۔ بے آواز قدموں سے بھاگ گئی اور دوڑ کر اپنی خواب گاہ میں چھپ گئی۔ میں نے آنسوؤں میں تیرتی ہوئی انہی سبز پتیوں کو دیکھا۔ اس دنیا میں کوئی کیا بدل سکتا ہے؟ نہ اپنی فطرت، نہ اپنی آنکھوں کا رنگ، نہ اپنے وحشی دل کے ڈھنگ۔۔۔

''اچھا، تو میری آنکھیں چیتے کی ہیں؟ مگر کیا تم نے کبھی کسی چیتے کو روتے دیکھا ہے کنور؟ میری طرح روتے دیکھا ہے؟ آنسوؤ! بند ہو جاؤ۔۔۔ چیتے رویا نہیں کرتے، میں نے آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ لیے، واقعی، مجھے چیتے ہی کی طرح بہادر اور بے رحم ہونا پڑے گا!

''تین ماہ میں اُس کے زخم بھر گئے، اور وہ اس قابل ہو گیا کہ کبھی میرے سہارے، کبھی اُرملا کے سہارے پائیں باغ میں چل سکے۔ رستے میں اِدھر آتے ہوئے، چھتے ہوئے برآمدے کے باہر تم نے وہ چھوٹا سا باغ ضرور دیکھا ہوگا، جس میں اخروٹ، شاہ بلوط اور تنگ کے درخت ہیں۔ اُس کے بیٹھنے کی جگہ خاص طور پر وہ تنگ کا درخت تھا جو باغ کے مغربی جانب واقع ہے، کھڈ کی طرف، جس پر انگور کی بیلیں سب سے گھنی اور گہری ہیں، اور جس کے قریب سنگِ مرمر کی دیوار ہے، جو باغ کو کھڈ سے جدا کرتی ہے۔ اس باغ کے نیچے کھڈ چار ہزار فٹ گہری جاتی ہے، اور یہاں سے بان گنگا کی ندی، اور اُس کی وادی، اور اُس سے پرے ہمالیہ کے اونچے اونچے برفیلے پہاڑوں کا کوہستانی سلسلہ چلتا ہے۔۔۔

کنور راج کو وہ جگہ بہت پسند تھی، اور جب وہ اِس قابل ہوا کہ اپنے کمرے سے اُٹھ کر باہر چل پھر سکے تو وہ اکثر یہاں آ کر ٹہلتا تھا۔ کبھی آرام کرسی پر بیٹھ جاتا، کبھی یہیں صبح کا ناشتا کرتا تھا۔ شام کی چائے تو اکثر یہیں ہوتی تھی۔ چاندنی راتوں میں اکثر میں نے اُسے اُرملا کے ساتھ ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے۔ جب اُن دونوں کا خیال تھا کہ میں اپنی خواب گاہ میں پڑی سو رہی ہوں گی۔ میں نے کنور راج کو اُرملا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر ٹہلتے دیکھا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے لگے ہوئے، ایک دوسرے پر جھکتے ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ تنگ کا درخت ہے، اُرملا انگور کی بیل ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے اس طرح لپٹ گئے ہیں جیسے اب کبھی جدا نہ ہوں گے، اور ان دونوں

کے اوپر نیا نویلا چاند کسی قاتل کے خنجر کی طرح خوب صورت۔۔۔ اور میں صحن کے پردوں میں چھپی ہوئی، دیکھتی ہوئی، روتی ہوئی۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے ڈاکٹر گھوش! وہ دن کتنے خوب صورت تھے جب میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی امیدوں کا خون ہوتا دیکھا تھا۔ کبھی اُرملا سنگِ مرمر کے چبوترے پر چڑھ جاتی، اور اُس پر کھڑے ہو کر تنگ کے پیڑ سے لٹکے ہوئے انگور کے خوشوں سے انگور توڑ کر انگور کھانے لگتی۔ ایک دانہ اپنے منہ میں، ایک دانہ کنور راج کے منہ میں، ایک آنسو میرے رخسار سے بہتا ہوا، ہَوا ہولے ہولے دف بجاتی ہوئی، دور نیچے بان گنگا کا دھیما دھیما آرکسٹرا، اور چبوترے پر کھڑی پاؤں میں پائل کھنکھناتی ہوئی، ناچتی ہوئی، رجھاتی ہوئی اُرملا، اور چاند کے سیمیں نم سے ترشا ہوا میرے کنور راج کا تیکھا رُخ، مسکراتا ہوا، ہنستا ہوا، بے حد حسین اور بے پناہ جواں جسم، ناچتی ہوئی اُرملا کو سنگِ مَرمَر کے چبوترے سے ایک پھول کی طرح اُٹھا کر اپنے سینے سے لگا لینے والا۔۔۔ واقعی، اس درد کی کوئی منزل نہیں ہے۔ زخم جتنا گہرا ہوتا ہے اُتنا ہی مزہ دیتا ہے، پھر سوچ سوچ کر میرے دل میں خیال آیا کہ اُرملا کے حُسن کی کاٹ کوئی اُس سے بہتر حُسن ہی کر سکتا ہے۔ اور یہ سوچتے ہی میرا ذہن چمپا کلی کی طرف گیا۔۔۔ دیکھیے، یوں تو رانیاں اور راج کماریاں بہت حسین ہوتی ہیں، مگر اُن کا حُسن چیختا چلاتا ہوا حُسن نہیں ہوتا۔ وہ کچھ تو حسین ہوتی ہیں، کچھ خاندانی وجاہت اور دبدبہ اُن کے حُسن میں اضافہ کر دیتا ہے، کچھ دیکھنے والے کا تصور، ایک قبول صورت راج کماری بھی کیا سے کیا دکھائی دینے لگتی ہے۔ میں جانتی ہوں، اُرملا ایسی خوب

صورت نہ تھی، وہ واقعی حسین تھی مگر وہ مارلن منرو تو نہ تھی، وہ چمپا کلی بھی نہ تھی۔

''یہ چمپا کلی کون ہے؟''

''ہر ریاست میں ایسی لڑکیاں رکھی جاتی ہیں، جن کا بچھرا ہوا بے پناہ حُسن اپنے سستے عشوہ و انداز سے مرد کو بے قابو کر سکتا ہے، اُسے پاگل بنا سکتا ہے۔ اُس کا زہد و تقویٰ آنِ واحد میں لوٹ سکتا ہے۔ اپنے ہاں یہ روایت بہت پرانی ہے، اور راجہ اِندر کے وقت سے چلی آ رہی جنھوں نے گرو وشوامتر کی تپسیا سے اپنا سنگھاسن ڈولتا دیکھ کر مینکا اپسرا کو اُن کی تپسیا بھنگ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔۔۔ وہ کہانی تو تمھیں یاد ہوگی۔''

میں نے مسکرا کر آہستہ سے سر ہلا دیا۔

''بس اُسی دن سے ہر راج میں ایسی لڑکیاں رکھی جاتی ہیں، نام بدلے جاتے ہیں اُن کے ہر عہد میں، لیکن کام نہیں بدلتا۔ دیوتا اُنھیں 'اپسرا' کہتے ہیں، کوئی اُنھیں 'دیوداسی' کہتا ہے، کوئی 'کنیز' کہتا ہے۔ آج کل وہ 'کال گرل' یا 'کنٹریکٹ گرل' کہلاتی ہیں۔ مگر کیوں نام بدلنے سے کہیں انسان بدلتے ہیں؟ یا ان کا پیشہ بدلتا ہے؟ بات تو وہی ہے۔

چمپا کلی ایسی ہی ایک لڑکی تھی اور میرے ہاں اسی کام کے لیے ملازم تھی۔ اُسے صرف مشکل ترین مرحلوں میں ڈالا جاتا تھا، اور آج تک اُس کا ریکارڈ تھا کہ وہ کبھی ناکام نہیں لوٹی تھی۔ ایک ہی پلّے میں تو بہ تڑوا دیتی تھی وہ، اور مرد کو اس درجے رام کر لیتی تھی کہ وہ اُس کے ہاتھ سے گھاس بھی کھانے کو تیار ہو جاتا تھا، اور مزے کی بات

یہ ہے کہ اُسے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ بس وہ ایک بار مرد کے قریب سے ترچھی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی گزر جاتی تھی، اُس کے بعد اُسے کچھ نہیں کرنا ہوتا تھا۔ اِسی لیے اُسے ہمیشہ مردوں کی نگاہوں سے دور محل کے زنانے میں الگ رکھا جاتا تھا، اُس پر کڑی پابندیاں عائد ہوتی تھیں، بڑی سختی سے اُس کی نگہداشت کی جاتی تھی، اور اُسے مردوں سے دور رکھا جاتا تھا، کیوں کہ بم اسلحہ خانے میں رکھا جاتا ہے، اور اُسے صرف ضرورت کے وقت استعمال کرتے ہیں۔

''مگر اس بار میں چمپا کلی کو استعمال کرتے وقت بے حد خائف تھی۔ کنور راج بچہ تو ہے نہیں کہ معاملہ بندی کو نہ سمجھ سکے، یا شطرنج کی اِس چال کو، جس کا مہرہ چمپا کلی تھی۔ ممکن ہے، اُسکا شبہ مجھ پر پڑے، اور یہ بہت ممکن بات ہوگی۔ خائف ہونے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ کنور راج اُرملا کی محبت میں اِس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ مجھے یقین نہیں تھا، وہ کبھی چمپا کلی سے التفات کرے گا، مگر کوشش کرنے میں حرج کیا ہے! اگر اپنا حُسن ہار جائے تو کسی دوسرے کا حُسن مستعار لینے میں مضائقہ؟ عشق اور جنگ میں سب جائز ہے، اور اگر بھولے سے بھی ایک بار کنور راج نے چمپا کلی سے التفات ظاہر کیا تو میں خود اُرملا کو وہاں لے جا کر اُس کی آنکھوں سے اُسے سب کچھ دکھا دوں گی۔ سب سے پہلا کام تو میں نے یہ کیا کہ چمپا کلی کو اُرملا کی تحویل میں دے دیا۔ اب وہ اُرملا کی باندی ہوگئی، مگر ہر روز مجھے رپورٹ دیتی رہتی تھی۔

''آج کچھ نہیں ہوا۔''

''آج بھی دن خالی گیا۔'

''راج کماری جی تو مجھے محل سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتیں، کہیں کنورراج کی نظر مجھ پر نہ پڑ جائے۔ وہ اِٹھلا کر بولی۔

آج تو میں نے توبہ توبہ۔۔۔' چمپا کلی نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا، ایسی ہمت دکھائی کہ پسینے چھوٹ رہے ہیں اب تک، میں نے راج کماری جی سے صاف کہہ دیا، آپ ڈرتی ہیں شاید مجھ سے۔۔۔۔ اُرملا جی کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا، بولیں، 'آج شام کی چائے تم پلاؤ گی کنورراج کو، پائیں باغ میں موجود رہنا، سو میں رہی، میں چائے پلائی، کنور جی مجھے دیکھتے رہے، آنکھوں ہی آنکھوں میں چائے کے ساتھ ساتھ مجھے پیتے رہے، میں وہ نگاہیں پہچانتی ہوں۔'

''چمپا کلی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دوسرے دن وہ پھر آئی۔

''آج تو اُرملا جی نے مجھے کنورراج کی خواب گاہ میں بھیج دیا۔۔۔ دودھ کا گلاس دے کر۔۔۔ میں رکھ آئی۔۔۔'

''کنورراج کمرے میں تھے؟' میری سانس رکنے لگی۔

''ہاں تھے۔'

''دیکھا اُنھوں نے؟'

''ہاں، دیکھا۔'

''ہاتھ بھی پکڑا؟' میرا دل دھڑکنے لگا۔

''نہیں۔۔۔ بس دیکھتے رہے۔ میں نے دودھ کا بھرا گلاس تپائی پر رکھ کر جالی سے ڈھانپ دیا۔ تپائی کو اُن کے چھپر کھٹ کے قریب لگا دیا۔ جھکنے میں، اور پھر جھک کر اوپر اٹھنے میں، آپ جانتی ہیں، دنیا کی کوئی عورت میرا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ کنورراج کا چہرہ فق تھا، اور ہاتھ کانپ رہے تھے۔ میں کچھ دیر اُن کے چھپر کھٹ کے پاس کھڑی تپائی ٹھیک کرتی رہی۔ جب وہ کچھ نہیں بولے تو کولھے مٹکا کر چلنے لگی، اور دو قدم چل کر مڑ کے انھیں ترچھی نظروں سے دیکھ کر کہنے لگی: میں جاؤں؟

''وہ پہلے تو کچھ نہیں بولے، پھر بولنے کی کوشش کرتے رہے، آخر کار کہنے لگے: ذرا میرے چھپر کھٹ پر چڑھ کر اُس روشنی کو ٹھیک کرتی جاؤ جو میرے سر کے پیچھے ہے، پڑھنے میں روشنی کا زاویہ ٹھیک نہیں بیٹھتا۔

''میں نے لہنگا ٹخنوں سے اوپر گھٹنوں تک چڑھا لیا، اور چھپر کھٹ پر چڑھ گئی، اُن کے قریب روشنی ٹھیک کرتی رہی، اور میرا خیال ہے کہ وہ میرے ٹخنوں کی گولائی اور میری صندلیں پنڈلیوں کا گدا گدا پن دیکھتے رہے ہوں گے۔ میں ہر پل اپنی ننگی ٹانگوں [illegible] کی منتظر تھی، مگر جانے وہ کیسے صبر کر گئے۔

''پھر؟''

''پھر میں چھپر کھٹ سے نیچے اتر آئی، اور اُن کے پائنتی کھڑی ہو کر بڑی ادا سے بولی: آپ کے پاؤں دبا دوں؟

''وہ بڑی مشکل سے بولے، کل رات کو آنا۔''

''اتنا کہہ کر وہ منہ میں دُوپٹہ لے کر زور زور سے ہنسنے لگی۔۔۔ 'رانی جی! مردوں کے پاؤں بڑے چکنے ہوتے ہیں، عورت کو دیکھتے ہی پھسل جاتے ہیں، مگر عورت ہونی چاہیے۔''

''وہ اپنی ایک پازیب کو دوسری پازیب سے بجاتے ہوئے بولی، 'اب دیکھیے ،کل رات کو کیا ہوتا ہے!' وہ میرے سامنے انگڑائی توڑنے لگی۔''

''میں نے کہا، 'چل ہٹ، دفع ہو مردود!۔۔۔

''مگر دوسرے دن کے لیے میں نے سب انتظام کرلیا۔

چمپا کلی کو سب پڑھا لکھا دیا: اُرملا کو شبہہ تک نہ ہونے پائے۔ کنور جی سے کہنا، تم بارہ بجے رات کو آؤ گی۔ بتی گل کردیں، دروازہ بھیڑ دیں، مگر اندر سے بند نہ کریں۔ تم پروتما کو لے کر اندھیرے کمرے میں گھس جانا۔ پروتما کو چھپر کھٹ کے پیچھے چھپا دینا۔ جب ہم دستک دیں گے تو چھپر کھٹ سے مت اٹھنا۔۔۔ پروتما دروازہ کھول دے گی، روشنی ہم لے کر آئیں گے، ہمارے ساتھ اُرملا بھی ہوگی۔

''سمجھ گئی، سمجھ گئی۔' وہ شوخی سے سر ہلا کر بولی، ''سب سمجھ گئی۔۔۔ بے فکر رہیے رانی جی! کل سب ٹھیک ہو جائے گا۔' اس کی آواز میں لہجے میں، جذبے کی ایک ایسی لپک تھی جیسے وہ خود آنے والے کل کے لیے بے تاب ہو۔

''بات کا یہ رخ اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ چمپا کلی کی بے تابی دیکھ کر مجھے کچھ بُرا سا بھی لگا، مگر کنور راج کو اُرملا سے الگ کرنے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا،

اس لیے میں نے سب انتظام کرلیا۔ پروتما سے کہہ دیا، دیوان جی سے کہہ دیا کہ وہ آ کے مجھ سے شکایت کریں۔ اُرملا کو میں کل اپنے کمرے میں رات کے بارہ بجے تک روک لوں گی۔۔۔ پھر دیوان جی آئیں گے، سب ماجرا بیان کریں گے، میں حیرت میں رہ جاؤں گی، اُرملا کے چہرے کی طرف تکوں گی، جس کی آنکھوں میں آنسو ہوں گے، میں باور نہیں کروں گی۔ دیوان جی مجھ سے موقع واردات پر جانے کے لیے کہیں گے۔ میں اُرملا کو ساتھ لے چل دوں گی، ایک ہی نظر میں معاملہ ختم ہو جائے گا۔

''طے تو سب کچھ ہو گیا، مگر مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔ چمپا کلی کا بے قرار اور بے تاب جسم آنکھوں کو ڈستا رہا۔ صبح ہوئی، دوپہر ہوئی، شام ہوئی، رات ہوئی، رات کے بارہ بھی نہ بجے تھے کہ میں بے قرار ہو کر کنور جی کے کمرے کے دروازے تک آ پہنچی۔ ابھی چمپا کلی کا ایک قدم دروازے کے اندر تھا، دوسرا دروازے کے باہر، اور اُس کے پیچھے پروتما ایک سیاہ لبادہ اوڑھے کھڑی تھی کہ میں نے اندر جاتی ہوئی چمپا کلی کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا، اور اُسے بے دردی سے چابک پر چابک مارنے لگی۔

''تمہیں ایسا جسم رکھنے کا حق کیا ہے چمپا کلی؟ تم تو اُس کے سینے سے لگ کر سوؤ اور میں اُس کے قدم بھی نہ چھو سکوں! تمہیں اُس کے ہونٹوں کے بوسے ملیں اور میں اُس کی گالیاں بھی نہ سن سکوں، یہ کہاں کا انصاف ہے!''

چمپا کلی پہلے تو چند لمحے حیرت زدہ رہی، پھر چیخنے چلانے لگی، مگر سر جھکائے مار کھائے جاتی تھی، اور میرے پاؤں کو بار بار ہاتھ لگا کر رحم کی بھیک مانگے جا رہی تھی۔

اتنے میں اُرملا دوڑی دوڑی آئی، اُس نے میرے ہاتھ سے چابک چھین لی۔

''جانتی ہو یہ کیا کر رہی تھی؟'' میں نے اُرملا سے کہا۔

''اُرملا مسکرا کر بولی، جانتی ہوں!''

''کیا جانتی ہو؟'' میں نے بپھر کر پوچھا۔

''کنور جی کے کمرے میں جانے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''اور یہ جان کر بھی تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے؟''

''کیوں نہ ہو، وہ تو اندر ہیں ہی نہیں۔''

''اندر نہیں ہیں؟''

''ہاں .....انہوں نے آج صبح ناشتے پر مجھے سب بتا دیا تھا، وہ تو دوسرے کمرے میں سوئے ہیں''۔ اُرملا بولی، ''یقین نہ ہو تو اندر جا کر اطمینان کر لیجیے۔''

''مگر کمرے کے اندر جانے کی ضرورت نہ پڑی، کنور جی خود ہی دوسرے کمرے سے نکل کر مسکراتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے، چمپا کلی کی طرف دیکھ کر بولے، ''آپ نے اس پھول سے جسم کو ناحق تکلیف پہنچائی رانی جی! یہ جسم کیا چابک کھانے کے لائق ہے؟ یہ کومل بدن تو گود میں اٹھانے کے لائق ہے، چلو چمپا کلی! ہمارے کمرے میں چلو، آج ہم تمہارا بدن دبائیں گے۔'' وہ کھلکھلا کر شوخی اور شرارت سے ہنس پڑے۔ اُن کا لہجہ ایک عجیب خفتہ سے طنز میں بجھا تھا۔ چمپا کلی مجبوب ہو کر، پازیب بجاتی، وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

''رات کے دو بجے ہیں، آنکھوں میں نیند نہیں ہے، چمپا کلی نیچے غالیچے پر سسک رہی ہے، اور پوچھ رہی ہے، ''آپ نے مجھے کیوں مارا؟''

''میری مرضی۔'' میں نے سختی سے جواب دیا۔

''وہ رو کر بولی، ''خود ہی پلان بنایا، خود ہی فیل کر دیا۔''

''میری مرضی، تم پوچھنے والی کون ہوتی ہو؟''

''ہمارا بدن دُکھتا ہے۔'' اُس نے شکایت کی۔

''پھر میں کیا کروں؟''

''ہمیں اَور چابک مارے نہیں تو گلے سے لگا لیجیے۔''

''میں اُسے گلے لگا لیتی ہوں، اور اُس کے ساتھ سسکنے لگتی ہوں۔ اب میں رانی نہیں رہی، وہ میری باندی نہیں رہی .....اب ہم صرف دو عورتیں ہیں۔ میں اُس کا منہ چومتی ہوں وہ مجھ سے پوچھتی ہے، ''رانی جی! آپ نے کبھی پیار کیا ہے؟''

''تم نے کیا ہے؟''

''ہاں، بنسی سے کیا ہے۔''

''بنسی کون ہے۔''

''ہمارے گاؤں میں ایک گڈریا ہے رانی جی! میں نے پہلی مار اُس سے کھائی ہے۔ پہلا بوسہ اُسے دیا تھا۔ رانی جی! میں اُسے بھولی نہیں ہوں، وہی میرا مالک ہے''۔

''میں تجھے تیرے مالک کو سونپ دوں گی۔''

''اُس کا سارا جسم کانپنے لگتا ہے، وہ دونوں بانہیں میرے گلے میں ڈال کر میرا منہ چومنے لگتی ہے، اور میرے کان میں کہتی ہے، رانی جی! آپ نے کبھی پیار نہیں کیا؟''

''نہیں۔''

''رانی جی! آپ سے کسی نے پیار نہیں کیا؟''

''نہیں۔''

''رانی جی! کوئی آپ سے پیار کرے نہ کرے، آپ ضرور کسی سے پیار کر لیں۔''

''اچھا ہے، میں عورت بن کر تمہارے سنگ آج رو لی چمپا کلی! کل تمہیں تمہارے گڈریے کے گھر جہیز دے کر بھجوا دوں گی، پھر کوئی دیکھ نہ سکے گا۔ آنسوؤں کا یہ دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔''

''پھر وہ دن آ گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ اُس دن اُرملا اپنا فق چہرہ، کانپتے ہونٹ اور دھڑکتا ہوا دل لے کر یکا یک چائے کی میز سے اُٹھ گئی تھی، اور اُس کے جانے کے بعد ہی کنور راج نے اُرملا کو مجھ سے مانگ لیا تھا۔

''جہاں تم نے مجھے زندگی دی ہے، وہاں اِس زندگی کی خوشی بھی دے دو۔' وہ بولا۔

''میں نے تمھیں زندگی دی ہے؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہاں!' اُس نے جواب دیا، 'اگر تم مجھے اُس وقت جنگل سے اٹھا کر نہ لاتیں جب میں چیتے سے لڑائی کرتے کرتے بے ہوش ہو گیا تھا۔ تو میں کسی جنگلی جانور کا شکار بن گیا ہوتا، پھر جس تن دہی سے تم نے میری دیکھ بھال کی ہے، اُس کا بدلا میں اِس طرح چکا سکتا ہوں کہ ایک احسان اپنے اوپر اور لاد لوں، زندگی کا سب سے بڑا احسان! ۔۔۔کرو گی؟'

''ضرور کروں گی۔ مجھے اپنی آواز بڑی عجیب اور جھوٹی سی لگی۔''

''تو مجھے اپنا بنا لو۔''

میں چونک گئی، اور دل کے اندر کسی اندھیرے گہرے کھڈ میں پڑی ہوئی کسی امید نے سر اٹھا کے کنور راج کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''کیسے؟' بے اختیار میرے منہ سے نکلا، میرے دونوں ہونٹ بند ہو گئے، دونوں آنکھیں بند ہو گئیں۔ گلا رکتا ہوا معلوم ہوا، اور دل تھمتا ہوا۔۔۔ ایسا لگا جیسے ابھی ہاتھ پاؤں سے جان نکل جائے گی، حالانکہ کب سے مجھے اس لمحے کا انتظار تھا، اور میرا خیال تھا کہ میں نے اس لمحے کا سامنا کرنے کے لیے اچھی ریہرسل کر لی ہے، وہ سب بے کار گیا۔ اب آنکھیں کیسے کھولوں، اور ہونٹوں سے کیسے بولوں، وہ سب جان لے گا۔ مجھے جلد خود پر قابو پا کر، آنکھیں کھول کر، ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر اُسے 'ہاں' کہہ دینا چاہیے، مگر لمحات گزرتے گئے، اور میں کچھ نہ کہہ سکی۔ مجھے معلوم نہیں تھا، میری کمزوری ایسی شدید درجے کی ہے کہ قدم جہاں کے تہاں جم جائیں گے، اور میں کچھ نہ کہ

سکی۔ پگلی! تو نے ایک لمحے کے لیے بھی کیوں نہ سوچا تھا کہ ایسا نہ ہوگا، اور جیسے تو نے سوچا تھا ویسے ہوگا۔ سب کچھ تیرے سامنے ہو رہا تھا، پھر بھی تو نے دوسری طرح سے سوچ لیا۔ ہر بات، ہر ادا، ہر تبسم، ہر لمس کے خلاف جا کر بھی تو نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ تیرا ہو جائے گا؟ کبھی تیرے ہاتھوں کو اُس کے ہاتھ نہیں ملے، کبھی تیرے ہونٹوں پر اُس کے ہونٹوں کی چھایا نہیں پڑی، تیری کمر ہمیشہ اُس کے لمس سے کنواری رہی، پھر باولی! تو نے کیسے ایک لمحے کو بھی یوں سوچ لیا۔ ہائے، مگر وہ ایک لمحہ کیسا روشن تھا! جیسے سارے جسم میں چراغاں ہو گیا ہو، اور میں اس ادا، امید، تمنا اور سہارے کی سہانی روشنی میں ایک پل کے لیے بھیگتی کھڑی رہ گئی۔

''پھر میں گھوم گئی، اور قریب کے ایک ستون کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ اب میری پیٹھ اُس کی طرف تھی اور میری پیٹھ اس لیے اس کی طرف تھی کہ کہیں وہ میرے آنسو نہ دیکھ لے، جواب بڑی بے شرمی اور بے حیائی سے میری آنکھوں سے نکل نکل کر میرے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد مجھے ہولے سے اُس کے قدموں کی چاپ سنائی دی، اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ قریب آ کر کھڑا ہو گیا، پھر اُس کا ایک ہاتھ ستون پر گیا، اور بے دھیانی میں میرے ہاتھ کو چھونے لگا۔ چھوتے رہو، دھیرے دھیرے اسی طرح میرے دل کے دروازے پر دستک دیتے رہو، اسی طرح صدیاں گزر جائیں، یہ لمحہ جاوداں ہو جائے۔

''مگر وہ پھر بول اٹھا، 'رانی جی! آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔' اُس

کے لہجے میں خفیف سی تلخی تھی۔

''میں چپ رہی۔

''کیا میں اس لائق نہیں ہوں؟ میں پھر بھی کچھ بول نہ سکی۔ وہ میرے سامنے آ گیا۔ ارے!۔۔۔ بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا آپ تو رو رہی ہیں!'

میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اُس سے کہا، 'یہ خوشی کے آنسو ہیں۔ اسی دن کا تو مجھے انتظار تھا، کب تم مجھ سے کچھ مانگو۔۔۔ میں وعدہ کرتی ہوں، اُرملا تمھاری دلہن بنے گی۔ چند لمحوں کے لیے اُس کے ہاتھ کی انگلیاں میرے ہاتھوں کے اوپر رکیں، ایک لمحے کے لیے اُس نے میرا ہاتھ زور سے دبایا، پھر وہاں سے الگ ہو کر وہ دوسری کھڑکی میں کھڑا ہو گیا۔

میں کمرے سے باہر چلی گئی، اُس کا چہرہ خوشی سے گلنار تھا۔

''کنور راج کو گڑھی سے رخصت ہوئے مشکل سے پندرہ دن ہوئے ہوں گے کہ اُن کی طرف سے اُرملا کے لیے پیغام آ گیا۔ وزیر مادھو رام خود پیغام لے کر آئے تھے۔ بڑے تزک و احتشام سے انھیں گڑھی کے خاص مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ صرف شام کی چائے پر میری اور اُن کی ملاقات ہوتی تھی، اُرملا بھی موجود ہوتی تھی۔ وزیر مادھو روز میرا منہ تکتے تھے، اور روز مایوس ہوتے تھے، کیوں کہ میں اِدھر اُدھر کی سب باتیں کرتی تھی، مگر اِس معاملے پر بالکل گفتگو نہیں کرتی تھی۔

''اُرملا تو بے چاری آنکھ نہ ملا سکتی تھی، مارے شرم کے اُس کے رخسار شہابی ہو

جاتے، کبھی کسی اندرونی خوف سے اس قدر پیلے پڑ جاتے کہ اُس کا چہرہ زرد گلاب کی مانند دکھائی دینے لگتا۔ وزیر مادھو رام کی آنکھوں میں ایک سوال تھا، مگر اُرملا تو خود مجسم سوال تھی، اُس کا ذہن اور اُس کی روح مجھ سے بس ایک ہی جواب سننے کے منتظر تھے۔ مگر معاملہ ایسا نازک تھا کہ اُرملا منہ سے خود کچھ بول نہ سکتی تھی اور وزیر مادھو رام بھی پیغام دینے کے بعد یہ بدتہذیبی نہیں کر سکتے تھے کہ مجھ سے فوراً جواب مانگیں اور میں نے بظاہر ریاست کے کاموں میں اپنے آپ کو اِس قدر الجھائے رکھا تھا کہ گویا فرصت سے اِس اہم مسئلے پر سوچ بچار کی گھڑی ہی نہ آئی تھی۔

وزیر مادھو رام کو ہماری گڑھی میں اس طرح پڑے ہوئے دس دن گزر گئے۔ ہر روز اُرملا کی بے تابی میری خاموشی دیکھ کر بڑھتی جاتی تھی۔ اور وہ یہ سمجھ بھی نہ سکتی تھی کہ پریزانی کیا ہے۔ 'ہاں' کہہ دینے میں اب باقی کیا رکھا ہے؟ میں کیوں چپ ہوں؟ معاملے کو لٹکا کیوں رہی ہوں؟۔۔۔ اُس کی آنکھوں میں یہ سب سوال تھے، اور جب کبھی وہ چور نگاہوں سے مجھے دیکھتی تھی تو بہت سے مجرموں کی طرح یہ سوال ایک ساتھ اُس کی آنکھوں سے جھانکتے دکھائی دیتے تھے۔

''پندرہ دن اِسی خاموشی میں گزر گئے۔ آخر جب مجھے معلوم ہوا کہ اب وزیر مادھو رام جیسے گھاگ اور شاطر آدمی کا پیمانہ صبر لب ریز ہونے کو ہے، اور ہر اگاؤں سے کنور راج جی کی اِس سلسلے میں دو یا دو دہانیاں بھی آ چکی ہیں تو میں نے پندرھویں دن شام کی چائے پر اُن سے کہہ دیا، ''مجھے یہ رشتہ منظور ہے''۔ میں نے اچھی طرح سے غور کر لیا

ہے، اپنے مشیروں سے صلاح بھی کر لی ہے۔۔ سب کی متفقہ رائے یہی ہے کہ اس رشتے سے ہر گاؤں اور زرگاؤں علاقوں کے آپس کے تعلقات بے حد خوش گوار ہو جائیں گے۔ اس لیے ہر لحاظ مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔

''اُرملا کے چہرے پر خوشی کی گلابیاں چھلکنے لگیں، وزیر مادھو رام کے چہرے پر اطمینان کی ایک روشنی دوڑ گئی۔ شکریے کے اظہار میں وہ بار بار جھک جھک کر کورنش بجالاتا۔

''مگر ایک شرط ہے۔۔۔' میں بولی۔

''وزیر مادھو رام کورنش بجاتے بجاتے رک گئے، بولے کیا ہے؟'

''میں نے کہا، 'دیوان جی!۔۔۔ میں نے شرط کا لفظ غلط استعمال کیا ہے، لڑکی والوں کی طرف سے کوئی شرط نہیں ہوتی، مگر ہاں دو ریاستوں کا معاملہ ہے، اور آپ جانتے ہیں، دیول گاؤں کے معاملے کو لے کر آپ کے اور ہمارے تعلقات میں کیسی کشیدگی آئی ہے، کتنے برس تک کیسی شدید تناتنی بھی رہی ہے۔ معاملہ ریزیڈنٹ بہادر کے ہاتھ سے نکل کر اوپر وائسرائے تک جا پہنچا ہے۔ لاکھوں روپے ہم لگا چکے ہیں، میں سمجھتی ہوں کہ اس سے اس شبھ کام سے پہلے اس تنازع کا فیصلہ بھی ہونا چاہیے۔ آپ برطانوی حکومت سے اپنا کیس واپس لے لیں، دیول گاؤں خود بہ خود ہمارا ہو جائے گا۔ کنور جی کو بس ایک خط لکھنا ہے برطانوی سرکار کو۔۔۔ بس دو سطریں۔'

وزیر مادھو رام حیرت سے میرا منہ تکنے لگا، اُرملا کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے

لگیں۔ اُس کا سینہ اور زور سے ہل رہا تھا۔''

''کیوں؟۔۔۔'' میں نے پوچھا، ''ایک گاؤں کے اِدھر سے اُدھر ہونے میں کوئی ایسا بڑا نقصان ہو جاتا؟ یہ ایسی کون سی بڑی شرط تھی جس پر مادھورام وزیر حیرت سے آپ کا منہ تکنے لگے۔''

''تم نہیں جانتے ڈاکٹر! تم اِس علاقے میں نئے نئے آئے ہو۔ دیول گاؤں ہمارے علاقے اور ہرگاؤں کے علاقے اور آس پاس کے پچیس تیس تعلقوں میں سب سے بڑا دھرم استھان ہے۔ جینیوں کا اِس سے بڑا دھرم استھان کہیں نہیں ہے۔ ہر سال لاکھوں لوگ دور دور سے یہاں یاترا کو آتے ہیں، اور کئی کروڑ روپے کا چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہرگاؤں کے تعلقے کی آمدنی دیول گاؤں کی وجہ سے ہے، اور اگر ہرگاؤں سے دیول گاؤں کا ایک گاؤں چھین لیا جائے تو اس تعلقے کی ساری شان گھٹ کے آدھی ہو جائے۔''

''مگر رانی جی! اِس دیول گاؤں پر آپ کا کیا حق ہے؟'' سچ پوچھو تو حق کوئی نہیں ہے، مگر خوش قسمتی سے کہیے، یا بدقسمتی سے کہیے، دیول گاؤں ہمارے علاقے کی سرحد پر واقع ہے۔ ہے تو ہرگاؤں کے علاقے میں، مگر چند سَو گز زمین دیول گاؤں کی ہمارے حصے میں بھی آتی ہے، اس لیے ہمارے پتا جی نے اپنے وقت میں ریزیڈنٹ بہادر سے کہہ سن کے اُس پر اپنا حق جتا دیا، اور معاملے کو کھینچ کھانچ کر پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ تک پہنچا دیا، جہاں وہ اب تک چل رہا ہے، اور دونوں ریاستوں کے وقار کا

مسئلہ بن چکا ہے۔''

''تو پھر آپ نے ایسی کڑی شرط کیوں رکھی؟''

''کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ ہرگاؤں تعلقے کا کوئی بھی مالک دیول گاؤں کو ہمارے علاقے میں دینے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ دیول گاؤں تو کنور راج کے تعلقے کی جان ہے۔

''مجھے معلوم تھا، وزیر مادھورام کو معلوم تھا، اور اُرملا کو معلوم تھا کہ میں نے کتنی بڑی شرط رکھ دی ہے، جسے دوسری طرف والے کسی طرح قبول نہیں کر سکتے۔ جیتے جی کون خودکشی کرگا! اِسی لیے تو حیرت سے وزیر مادھورام اور اُرملا مجھے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

''وزیر مادھورام اُٹھ کر جھکے، جھک کر کورنش بجالائے، بولے، 'میں آپ کی باتیں کنور جی تک پہنچا دوں گا۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ مجھے اپنے تعلقے سے آئے ہوئے بہت دن ہو گئے ہیں۔'

''اُس رات، جب میں کھانے کے کمرے سے نکل کر اپنے شب خوابی کے کمرے میں جانے لگی تو پیچھے سے آ کر اُرملا نے میرے ساڑھی کا پلو کھینچ لیا، اور گھبرا کر بولی، 'یہ کیا کیا؟۔۔۔ اتنی کڑی شرط لگا دی؟ جسے وہ کبھی منظور نہیں کر سکتے۔'' تم تو کہتی تھیں کہ وہ دل و جان سے تمھیں چاہتے ہیں۔'

''ہاں، وہ تو ٹھیک ہے، مگر دیول گاؤں!۔۔۔'

''میری بہن کے سامنے ایک گاؤں کی حیثیت کیا ہے؟'

''مگر وہ کوئی گاؤں تھوڑی ہے، وہ تو کنور جی کی ریاست کا دل ہے۔'

''تو جب وہ دل تمھارے سپرد کر چکے تو ایک گاؤں دینے میں کیا حرج ہے؟'

''اُرملا چپ چاپ میرے چہرے کی طرف تکنے لگی۔

''میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔' میں نے اُرملا کے گال پیار سے تھپتھپا کر کہا، 'کہ وہ میری گڑیا سے کتنی محبت کرتے ہیں؟'

''اُرملا لاجواب ہوگئی، چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اُس کا چہرہ کھلا گیا تھا۔ وہ تو بالکل پھول کی طرح ہے، اور پھول کی طرح میں نے اُسے رکھا ہے، اور دل و جاں سے چاہتی بھی ہوں اُسے۔ پندرہ دن تک میں اپنے دل کو سمجھاتی چلی آ رہی تھی، اور میرا خیال تھا کہ آج جب میں وزیر مادھو رام سے گفتگو کرنے گئی تو مجھے پوری امید تھی کہ میں نے اپنے دل کو خوب سمجھا لیا ہے، اور آج میں وزیر مادھو رام کو 'ہاں' بول دوں گی، اور وہ غیر مشروط 'ہاں' ہوگی، پھر اچانک، جانے کیسے، یہ شرط درمیان آ گئی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا!

''دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ اُرملا کی آنکھیں ہر وقت بھیگی سی رہنے لگیں۔ اُس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آنے لگے، وہ اپنے آپ میں گم رہنے لگی، گرد و پیش سے بیگانہ، اداس، مغموم، ٹھنڈی سانسیں بھرے والی اُرملا، اکثر تیتک کے پیڑ کے نیچے بیٹھی رہتی، جو پائیں باغ میں ہے، اور جہاں چاندنی راتوں اور شفق کی گل زار تنہائیوں

میں وہ دونوں اکیلے ٹہلا کرتے تھے۔ دس روز گزر گئے، بیس روز گزر گئے، ایک مہینہ گزر گیا، تیسرا مہینہ گزر گیا۔ کنور راج کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اُرملا اب تیزی سے سانس لیتی تھی۔ اُس کی آنکھوں اور رخساروں پر ایک غیر صحت مند چمک آ گئی تھی۔ اور وہ کسی صورت میں مجھ سے آنکھیں ملانے کو تیار نہ تھی، مگر میرے لیے گھبرانے کی کوئی بات نہ تھی۔ اُرملا یقیناً اُسے بھول جائے گی۔ اُسے بھی کنور راج کی طرح بھولنا ہوگا، اپنا دل سخت کر لینا ہوگا، کیوں کہ ہم لوگوں کی شادیاں، محبت کی شادیاں کہاں ہوتی ہیں! ہم لوگ دیول گاؤں کی طرح ہیں، پوجے جاتے ہیں۔۔ اور جو پوجے جاتے ہیں، وہ محبت نہیں کر سکتے۔ اُرملا! تمھیں بھی اپنی محبت کو خیر باد کہنا ہوگا، اور وہیں شادی کرنی ہوگی جہاں تمہاری بہن 'ہاں' کرے گی۔

''پھر ایک دن، جب میں اُرملا کے کمرے میں بیٹھی اُسے اپنی نئی کویتا سنا رہی تھی، ایک خادمہ مجھے یہ بتانے آئی کہ ہرگاؤں سے وزیر مادھو رام کوئی ضروری سندیسا لے کر آئے ہیں۔

''اُرملا اُس وقت اپنی سنگھار میز پر بیٹھی آنکھوں میں کاجل لگا رہی تھی، اور آئینے میں مجھے دیکھ کر مجھ سے کویتا سن رہی تھی۔ جس وقت خادمہ نے آ کے یہ خبر دی۔ کاجل سے بھری سلائی اُس کی آنکھ میں تھی۔ یکا یک اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ چند لمحوں تک سلائی آنکھ میں دبائے وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی رہی، پھر ہولے سے سلائی نکال کر اُس نے جو میری طرف دیکھا تو مجھے اُس کی آنکھیں بڑی بڑی، روشن اور وسیع

معلوم ہوئیں۔۔۔ اِتنی وسیع، جیسے ساری دنیا کا درد اُن میں سما گیا ہو، اور مزید درد کی اُنہیں تلاش ہو۔ کرب کی کیسی حسرت ناک خواہش اُن آنکھوں میں تھی۔ میں اُٹھ کر خادمہ کے ساتھ باہر آ گئی۔ کویتا ابھی آدھی ہی سنائی تھی۔

''وزیر مادھورام نے مجھے کنور راج کا خط دیا۔ یہ پہلا خط تھا، جو اُنھوں نے اپنے ہاتھ کا مجھے لکھا تھا؛ میرے لیے نہیں تھا، لیکن لکھا تو مجھے ہی تھا:

رانی جی!

ایک دن میں نے آپ سے کہا تھا، میں اُرملا کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔ تو کیا دیول گاؤں نہیں دے سکتا، لے لیجیے، مگر اُرملا کو دے دیجیے.....

کنور راج

''دل دھک سے رہ گیا، آنکھوں میں آنسو چبھنے لگے۔ میرا سر خط پر اِتنا جھک گیا کہ وزیر مادھورام میرے آنسو نہ دیکھ سکے۔ میں روشنی کی کمی کا بہانہ کرتے ہوئے ایک کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ اب میری پیٹھ مادھورام کی طرف تھی، اور میری آنکھیں کھڑکی سے باہر ہمالیہ کی برفیلی چوٹیوں پر تھیں، اور ان سفید بادلوں پر، جو کنور راج کی طرح محبت کرنے کے لیے اپنی جگہ سے نیچے اتر آئے تھے..... میں نے سوچا: کنور راج اب تو میرے پاس انکار کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا ہے۔ اور یہ فیصلہ سب سے مشکل ہے ایک عورت کے لیے کہ جس سے وہ محبت کرتی ہے اُسے خود ہی کسی دوسرے کے حوالے کر دے۔

''میں نے اپنے آنسو چھپا لیے۔ میری جیسی عورت کو بہت سے آنسو چھپانے پڑتے ہیں۔ عورت کے لیے رونا بہت آسان ہے، قدرتی بھی ہے، مگر زرگاؤں کی رانی کے آنسو کوئی کیسے دیکھ سکتا ہے! جب سے تمھیں دیکھا ہے کنور راج! آنسوؤں کی ایک نہر سی اپنے سینے میں چھپائی ہے..... یہ نہر آنکھوں سے براہ راست اندر ہی اندر دل کے کسی نہاں خانے میں اتر جاتی ہے، اور کسی کو نظر نہیں آتی۔ تم کبھی میرے آنسو نہیں دیکھ سکو گے کنور راج..... کوئی بھی نہیں دیکھے گا!

میں نے یکا یک کھڑکی سے مڑ کر ایک چمکتی ہوئی شاداب مسکراہٹ اپنے چہرے پر لا کر کہا، 'اُن سے کہہ دینا، مجھے دیول گاؤں نہیں چاہیے..... بس، اب کچھ نہیں چاہیے۔ اب وہ جلد سے جلد لگن کی تیاری کر لیں۔'

''چھ ماہ بعد لگن کا سمے آ گیا۔ ہمارے ہاں قاعدہ ہے کہ ہم بارات کو چار دن پہلے زرگاؤں کی گڑھی میں بلا لیتے ہیں۔ کیوں کہ علاقہ پہاڑی ہے، یہاں کوئی موٹر روڈ نہیں ہے، اور چار روز پہلے برات کو گڑھی میں مہمان ٹھہرا لیتے ہیں، اور اب کے تو دو پڑوسیوں میں شادی تھی۔ دوسری ریاستوں اور تعلقوں سے بھی سب رشتے دار اور دوست آ گئے تھے، بے حد گہما گہمی تھی۔ لگن سے پہلے کے تین روز، مہمانوں کی تواضع میں کتنی جلدی گزر گئے..... پھر لگن کی رات آ گئی..... شادی کا منڈپ سج گیا۔ میں نے اُرملا سے کہا، 'آج میں تمھیں خود اپنے ہاتھوں سے سجاؤں گی۔ اُرملا خوشی سے مجھ سے لپٹ گئی۔

''میں نے اُس کی سب سہیلیوں کو اُس کے کمرے سے نکال دیا، خود اپنے ہاتھ سے اُسے دلہن کا جوڑا پہنایا، اُس کے بالوں میں پھول لگائے، بدن پر زیور سجائے..... ایڑی سے چوٹی تک اُس کا سنگھار کیا۔ اُس وقت وہ اتنی پیاری، پدمنی، کامنی سی لگ رہی تھی کہ جب میں نے اُسے آئینہ دکھایا تو وہ اپنی سندرتا سے خود ہی شرما کر میرے سینے سے لگ گئی، اور دھیرے دھیرے سسکیاں لینے لگی۔ بولی، 'مجھے ڈر لگتا ہے، میں تمھیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔''

میں اُسے بہلانے کی خاطر کمرے سے نکال کر باہر پائیں باغ میں لے آئی۔ باغ میں چاند تھا، انگوروں کے ادوے خوشے تھے اور دور کے پھولوں کی خوش بُو تھی۔ 'چھم چھم' کرتی وہ میرے ساتھ چلی، سیدھی تمک کے اُس پیڑ کی طرف جہاں اُن دونوں نے اپنی محبت کی پینگیں بڑھائی تھیں۔ جب ہم تمک کے پیڑ کے نیچے پہنچے تو چاند اوپر پتوں میں چھپ گیا۔

''اُف، یہاں کتنا اندھیرا ہے! چاند نظر ہی نہیں آتا۔''

''وہ بولی، اور سنگِ مرمر کے چبوترے پر چڑھ گئی، اور ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر چاند کو دیکھنے لگی، اور لڑکی کی طرح تالی سی بجا کر کہنے لگی، 'آہا جی، میں نے چاند دیکھ لیا!..... چاند دیکھ لیا!''

''نیچے اترو۔' میں نے اُسے ڈانٹ کر کہا، 'چبوترے کی دیوار سے نیچے اترو۔''

''نہیں..... وہ شریر لہجے میں بولی، 'میں انگور کا وہ گچھا توڑوں گی۔''

''میرے سمجھانے پر بھی وہ نہیں اتری، اور اُسی وقت اچک اچک کر اُودے انگوروں کا گچھا توڑنے کی کوشش کرنے لگی، اِس کوشش میں اُس کی پیٹھ میری طرف ہوگئی اور اب کے وہ اتنی زور سے اچھلی کہ گچھا پکڑ کر خوشی سے چیخ مارتے ہوئے اُس کا پاؤں جو چبوترے کی دیوار سے پھسلا تو نیچے ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں اُس کا بدن گرتا چلا گیا۔

''ہائے، وہ چیخ!..... میں کبھی اُسے بھول نہیں سکتی..... وہ چیخ..... دور تک ایک بھیانک گونج کی طرح پہاڑوں کی پہنائی میں ڈوبتی چلی گئی، پھر ایک لمحے کا مکمل سکوت..... پھر بان گنگا کی شوریدہ لہروں کی گرج ساری فضا پر چھا گئی!.....

زرگاؤں کی رانی چپ تھی؛ آنکھیں بند تھیں، سر تکیے سے لگا ہوا تھا، چہرے پر کوئی جذبہ نہ تھا، ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے، اور اُس کا سینہ زور زور سے ہل رہا تھا۔

''مگر.....'' میں نے کہا، ''پائیں باغ سے گزرتے ہوئے میں نے وہ چبوترہ دیکھا تھا، جو باغ کو کھڈ سے جدا کرتا ہے۔ وہ چبوترا تو اتنا چوڑا ہے کہ ایک آدمی اُس پر آسانی سے بستر لگا کر، پاؤں پھیلا کر سو سکتا ہے۔ اُس پر سے کسی کا پھسلنا بہت مشکل ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' زرگاؤں کی رانی اپنی آنکھیں کھول کر بولی، ''وہ گری نہیں تھی..... میں نے اُسے دھکا دیا تھا۔

''پہلا سال سوگ کا گزر گیا، کنور راج بہادر سنگھ والیٔ ہرگاؤں نے

مجھے شادی کا پیام دیا، جسے میں نے نامنظور کر دیا، دوسرے سال پھر اُس نے پیام دیا، میں نے پھر اُسے نامنظور کر دیا، تیسرے سال اُس نے پھر پیام بھیجا، میں نے اُسے منظور کر لیا، لگن کی تاریخ طے ہو گئی۔ لگن کا سے آن پہنچا، لگن ہو گیا۔ دونوں ریاستیں ایک دوسرے میں ضم ہو گئیں۔ دونوں ریاستوں کی پرجا کے لیے اس سے بڑا خوشی کا لمحہ اُن کی زندگیوں میں کبھی نہ آیا تھا۔ اُرملا سے شادی کے وقت بھی دونوں ریاستوں کے خاندان تو ایک ہوئے، مگر ریاستیں الگ الگ رہیں میری اور کنور راج بہادر کی شادی سے دونوں عمل داریاں ایک ہو رہی تھیں۔ ہماری جو اولاد ہو گی، وہ اب زرگاؤں اور ہرگاؤں، دونوں تعلقوں پر حکومت کرے گی..... رعایا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

''وہ سہاگ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ بڑی ٹھنڈی اور سنجیدہ لمحوں والی سہاگ رات تھی۔ میں دلہن کا لباس ضرور پہنے ہوئے تھی، مگر اندر سے خود کو دلہن محسوس نہ کرتی تھی۔ وہ دولہا بن کر آئے تھے، مگر کمرے کے اندر آ کر میری مسہری کے قریب آنے کی بجائے دیوار سے لگے صوفے پر بیٹھ گئے اور قریب کی دیوار پر لگی تصویر دیکھنے لگے تھے۔

''یہ تصویر یہاں نہیں ہونی چاہیے۔'' وہ بڑے سخت لہجے میں بولے۔ اُن کے چہرے پر کسی طرح کی گھبراہٹ نہ تھی۔

''کیوں؟..... اُرملا میری بہن تھی، میری چہیتی، میرے باپ کی آخری نشانی۔''

''میرا مطلب ہے، اِس تصویر کو کہیں اور لگا لو، یہاں خواب گاہ میں نہیں۔'' وہ کامل سکون سے بولے، پھر اُٹھ کر خود ہی تصویر کے قریب گئے۔ ایک تپائی پر چڑھ کر انہوں نے تصویر اتار لی، اور باہر کے ڈرائنگ روم میں لے جا کر ٹانگ دی، پھر اندر آ کر صوفے پر بیٹھ گئے، اور جوتا کھول کر جرابیں اتارتے اتارتے بولے، ''ایک بات پوچھوں؟.....''

''پوچھو!''

''تم اگر چاہتیں تو اُس روز جنگل میں مجھے چیتے سے لڑنے سے بچا سکتی تھیں، مگر تم نے ایسا نہیں کیا..... کیوں؟''

''میں دوسرے کے شکار میں دخل نہیں دیتی۔'' میں نے دلہن کی مسہری پر لیٹے لیٹے جواب دیا۔

''اور اگر چیتا مجھ پر حاوی ہو جاتا تو؟.....''

''تو میں اسے ہلاک کر دیتی، مگر پھر زندگی بھر تم سے بات نہیں کرتی۔''

''وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے، مگر وہیں صوفے پر بیٹھے رہے۔'' یہ میری مسہری پر کیوں نہیں آئے؟.....'' جرابوں سے کیوں کھیل رہے ہیں؟ میرے بدن میں یہ سردی لہر کیسی دوڑ رہی ہے؟ جیسے کوئی گلیشیئر میرے دل کی ڈھلوان پر اترتا جا رہا ہو، میرا جسم سن ہو رہا ہے۔ سہاگ رات کیا ایسی ٹھنڈی ہوتی ہے؟''

''جرابیں تہہ کر کے انہوں نے جوتوں پر رکھ دیں'' پھر اُٹھے..... میں نے

سمجھا، میری مسہری کی طرف بڑھیں گے، مگر نہیں..... وہ تو وہیں کھڑے ہو کر اپنی شیروانی اتارنے لگے۔ شیروانی اتار کر پھر صوفے پر بیٹھ گئے، اور اپنی قمیض کے طلائی بٹن کھولتے ہوئے بولے، ''میں نے ایک بار اُرملا سے کہا تھا کہ تم بہت کمزور لڑکی ہو، مگر تمہاری بہن بہت مضبوط ہے، خوبصورت بھی ہے..... مگر مضبوط زیادہ ہے، اتنی مضبوط کہ لگتا ہے کہ یہ عورت، شاید عورت ہی نہیں ہے۔''

''میں چند لمحے چپ رہی، خاموشی سے اُنہیں تکتی رہی۔ انہوں نے قمیض اتار دی تھی، اور اب اپنے چوڑے چکلے سینے کے بالوں پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیر رہے تھے۔ میں نے ڈانٹ کر کہا، ''ادھر آؤ!''

وہ صوفے سے اُٹھے اور میری مسہری کے قریب کھڑے ہو گئے۔ میں اپنے دونوں بازو اُن کے گلے میں حمائل کر کے اُنہیں اپنی طرف جھکاتے ہوئے بولی، ''اِدھر آؤ کہ میں بتاؤں کہ میں عورت بھی ہو سکتی ہوں!''

زرگاؤں کی رانی کا چہرہ اب نقاب میں نہ رہا تھا۔ وہ ایک عورت کا چہرہ تھا، جو سہاگ رات کی میٹھی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی، وہ اک نرم و نازک، محجوب، شرمائی ہوئی یادوں کا چہرہ تھا۔ عجیب چہرہ ہے! جب چاہتا ہے اپنے اوپر مردانہ پن طاری کر لیتا ہے، جب چاہتا ہے نسائیت کی نازک تفسیر بن جاتا ہے۔ ایسا عجیب و غریب چہرہ تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ زرگاؤں کی رانی کے بڈھے چہرے پر اُس وقت شادمانی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔

میں چپ رہا۔ اُن پُرمسرت لمحات کی یادوں میں خلل ڈالنا نہ چاہتا تھا۔ ممکن ہے، اس عورت کی زندگی میں یہی لمحات ہوں..... یہ لمحات جتنے طویل ہو جائیں، جتنے کھنچ جائیں، اچھا ہے۔

یکا یک اُن شادمان لہروں کی ریل پیل چہرے سے غائب ہو گئی۔ اب پھر وہ بڈھا چہرہ نقاب میں تھا۔ ایک عجیب تاسف انگیز، دردناک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر آئی، وہ دھیرے سے بولی، ''ایسی رات تو پھر کبھی آئی نہیں میری زندگی میں..... ایسا لگا، جیسے میں نے وہ سب پا لیا جسے میں نے کھو دیا تھا، جس کی تمنا میں نے زندگی بھر کی تھی جس کے لیے میں نے اتنی بڑی قربانی دی تھی۔ ایسا لگا، جیسے وہ واقعی مجھ سے اور صرف مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں، جیسے وہ اُرملا کو اب بھول گئے ہوں۔ مجھے لگا، اب اُن کے ذہن پر اُن کے دل و دماغ پر میں ہی چھا رہی ہوں۔

''رات کے تیسرے پہر میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسا لگا، جیسے وہ بے خبر میری بانہوں میں سو رہے ہیں۔ میں آنکھیں کھول کر غور سے اُن کا چہرہ دیکھنے لگی، چادر ہٹا کر اُن کا جسم دیکھنے لگی۔ جہاں جہاں چیتے کے پنجوں کے نشان رہ گئے تھے، وہاں وہاں اپنی انگلیاں دھیرے دھیرے پھیرنے لگی۔ ایک نشان کندھے پر تھا، ایک سینے پر، ایک دل کے قریب..... کاش، میری انگلیاں مرہم بن جائیں، اور ہر زخم کا نشان مٹا دیں!

یکا یک وہ چونک کر جاگے، اور اپنی پسلی کے زخم کے نشان پر میری انگلیاں چلتی محسوس کرتے ہوئے بولے، ''کیا میرے دل کے داغ ڈھونڈ رہی ہو؟''

''میں دھک سے رہ گئی۔ میرا گلا بھر آیا، جی چاہا، انہیں دھکا دے کر اپنے سے الگ کرلوں اور بھاگ کر کسی دوسرے کمرے میں جا کر چھپ کر روؤں، مگر انہوں نے مجھے اپنی بانہوں میں کس لیا اور اس طرح پیار کر رہے تھے، جیسے وہ فقرہ انہوں نے کسی گہری اہمیت سے نہیں کہا تھا، محض ایک سطحی پھچلتی ہوئی حرکت سے ایسا کہا تھا۔ اتنا پیار کیا کہ اس فقرے کا سارا زہر نکل گیا، بس ہلکی سے چبھن کہیں رہ گئی۔

''چند ہی دنوں کے بعد ہم پوجا کے لیے دیول گاؤں گئے، جہاں ہمارے علاقے کے نو بیاہتا جوڑے شادی شدہ زندگی میں خیر و برکت حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں۔ یہاں اونچے اونچے تین پہاڑی ٹیلے ہیں، جن کے گرد برہن ندی چکر کاٹتی ہوئے گھومتی ہے۔ اُس ندی نے ان تینوں ٹیلوں کو ایک خوبصورت جزیرے میں تبدیل کر دیا ہے۔ مندروں تک پہنچنے کے لیے برہن ندی کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ ہر ٹیلے پر دو دو مندر بنے ہوئے ہیں..... خوبصورت مدوّر مندر سرخ پتھر کے بنے ہوئے، ٹیلے کی چوٹی سے الجھتے ہوئے جیسے کسی دلہن کے مہندی بھرے ہاتھ مصروفِ دعا ہوں۔

''برہن ندی کو کئی جگہ سے پیدل عبور کیا جا سکتا ہے، کئی جگہ سے تیر کر بھی، مگر صرف ایک جگہ اُس کا پاٹ اتنا چوڑا ہے کہ اُسے کشتی ہی سے عبور کیا جا سکتا ہے۔ یہاں شاہی بجرے میں ہم سوار ہوئے، اور بجرا دھیرے دھیرے دوسرے کنارے کی طرف مڑنے لگا، جہاں پہلے دو مندروں کو جانے والی اونچی سیڑھیوں کا گھاٹ شروع ہوتا تھا۔

''اُن کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا، فضا میں ایک عجیب سا سکون تھا۔ دھیرے

دھیرے بجرا بہہ رہا تھا اور اوپر مندروں سے آتی ہوئی چاندگی کے گھنٹوں کی سریلی صدا، اور مندروں سے اوپر لوبان کے دھوئیں کی طرح فضا میں الجھتے ہوئے بادل، اور عورتیں..... رنگا رنگ ساڑھیوں میں ملبوس، بچے سنبھالتی ہوئی، اونچی لمبی پہاڑی چٹانوں کو کاٹ کر بنائی گئی بلند سیڑھیوں پر دھیرے دھیرے اوپر جاتی ہوئی، اوپر سے نیچے اترتی ہوئی۔ انسان کی یہ کاوش، جو آسمان کی طرف جاتی ہے اور وہاں سے کچھ لے کر واپس دھرتی کی طرف مڑتی ہے، کیسی عجیب بات ہے یہ اُس کا واپس دھرتی کی طرف مڑنا۔ جی چاہتا ہے، اگر ایک بار آسمان کی طرف جاؤں تو واپس نہ آؤں، چھلانگ مار کر اور اوپر کہیں چلی جاؤں..... مگر ایسا ہو نہیں سکتا، واپس دھرتی کی طرف آنا پڑتا ہے۔ کنور کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے۔ ہاتھ بجلی کی تاروں کے آخری دو سرے ہوتے ہیں، اور اب ہم دونوں کے درمیان بجلی کی ایک رَو چل پڑی ہے..... مدھم مدھم اور سست رَو، وولٹیج کی کمی ہے، مگر رَو چل رہی ہے، میں اُن سے پوچھتی ہوں،

''اچھا لگتا ہے؟''

''بہت اچھا۔''

''میں چپ رہتی ہوں، اب وہ مجھ سے پوچھتے ہیں، ''جب میں نے تمہیں دیول گاؤں دیا تھا، تم نے لیا کیوں نہیں؟''

''میں نے اُن کے شانے پر سر سکھ کے کہا، ''اب تو میں نے اُس سے بھی بڑی چیز لے لی ہے''۔

''ہاتھ کی رَو ایک دم رُک سی گئی، چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پھر دھیرے دھیرے چلنے لگی۔ ایک دن اس بجلی کو میں تیز کرلوں گی۔ وہ اُسی رفتار سے دوڑے گی جس رفتار سے وہ میری ہتھیلی میں دوڑتی ہے۔

''میں نے پوچھا، ''بھلا اِس ندی کو برہن کیوں کہتے ہیں؟ عجیب سا نام ہے..... برہن''

''برہن..... اس لیے کہ یہ ندی کبھی مندر کے دوار پر نہیں پہنچ سکتی، ہمیشہ نیچے قدموں میں چکر کھاتی رہتی ہے۔'' وہ کسی قدر اُداسی سے بولے اور دوار پر مندروں کی طرف دیکھنے لگے، پھر یکا یک پلٹ کر انہوں نے میرا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں لے لیا، اور غور سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے، ''تمہاری آنکھوں کے جنگل کتنے گھنیرے ہیں! کہیں سے اندر جانے کا راستہ نہیں ملتا۔''

''میں نے اُن کے سینے سے لگ کے سسک کے کہا، ''تم آؤ تو..... اس جنگل میں صرف ایک آدمی کے آنے کا راستہ ہے، اور اُس کے لیے بھی صرف آنے کا راستہ ہے، باہر جانے کا نہیں۔''

''وہ مسکرا دیے بولے، ''بہت مضبوط ہو، بالکل چٹان ہو!..... تم پر تو ایک دیول بنانا چاہیے۔''

''وہ تو بنا لیا میں نے، ایک تاج کی طرح اپنے سر پر سجا بھی لیا، کیا وہ مندر تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟''

''لاجواب ہو کر انہوں نے مجھے چھوڑ دیا، آگے چلے گئے، بجرے کی ریلنگ سے لگ کر کھڑے ہو گئے، اور نیچے برہن کے نیچے برفیلے خنک پانیوں میں دیکھنے لگے۔ میں اُن کے قریب چلی گئی، اور اُن کی طرح ریلنگ سے لگ کر نیچے دیکھنے لگی۔ پھر مجھے کچھ خیال آیا، میں نے اپنی چھنگلیا سے ہیرے کی ایک انگوٹھی نکالی، اور اُسے بجرے سے نیچے ندی میں گرا دیا۔

''یہ کیوں؟.....''

''شادی شدہ زندگی کی خوشی کے لیے.....''

''وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ بجرا گھاٹ سے لگنے لگا۔ زائرین کا شور بڑھ گیا۔ روز کی طرح رونق تھی، خلاف معمول کچھ نہ تھا۔ ہم نے کہہ رکھا تھا کہ ہماری آمد کو مشتہر نہ کیا جائے۔

''ہولے ہولے عام یاتریوں کی طرح ہم پہاڑ کی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اس طرح تو یہ سیڑھیاں اگر ساری اوپر چڑھتی جائیں تو میں ساری عمر ان پر چل سکتی ہوں۔

''وہ میرے ساتھ لگے لگے..... مجھے سہارا دے کر چل رہے تھے۔ حالاں کہ مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہ تھی، مگر مجھے اُن کی ضرورت تو تھی، اِس لیے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد میں ایسی بے سہارا ہو جاتی، گویا اُن کی مدد کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھا سکتی۔ وہ رک جاتے، اور اُن کا ہاتھ مضبوطی سے میری کمر میں آجاتا۔

اے دیول! تھوڑے سے اور اونچے ہو جاؤ۔ کبھی نہ تم تک پہنچ سکیں ہم.....

''یکا یک اُن کا ہاتھ میری کمر سے الگ ہو گیا بجلی کی رَو کٹ گئی۔ میں نے حیران ہو کر اُن کی طرف دیکھا، وہ مجھ سے الگ ہو کر کھڑے تھے اور اوپر دیکھ رہے تھے۔ بہت اوپر..... جہاں مندر کے اندر سے ایک عورت نکل رہی تھی۔ سفید ساڑھی میں ملبوس، پلّو سے اپنا سر ڈھانپے، چہرہ چھپائے وہ ایک شناسا چال سے چلتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہی تھی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا، مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟..... یہ اُرملا کیسے ہو سکتی ہے؟ مگر وہی چال تھی، وہی قد، وہی بُت، وہی رُخ کی تھلکی، جو اتنی دور سے ہمیں دکھائی دیتی تھی۔ مگر یہ اُرملا کیسے ہو سکتے ہے؟

''میں تو وہیں، جس سیڑھی پر کھڑی تھی، کھڑی کی کھڑی رہ گئی، مگر وہ جیسے کسی خواب کو اپنے قریب آتے، نیچے اترتے دیکھ کر مجھ سے بے خبر، دنیا و مافیا سے بے خبر، اُس کی طرف جانے لگے۔ یہ بھی نہ دیکھتے ہوئے کہ ان کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں، اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ پاؤں سے نہیں، اُس کی ایک نگاہ کی دوری سے جو نیچے اترنے والی عورت کے نیم مستور رُخ پر تیر رہی تھی، وہ اوپر ہی اوپر چڑھتے گئے، اور شاید اُن کے دل کی دھڑکن اور بے تابی کے ساتھ ساتھ اُن کے قدم بھی تیز ہوتے گئے۔

''جب وہ اُس عورت کے قریب پہنچے تو یکا یک ہَوا کے ایک تیز جھونکے سے اُس عورت کے سر سے پلّو سرک گیا، اور اُس کا پورا چہرہ اُن کی اور میری آنکھوں میں آ گیا۔ میں نے اطمینان کی ایک لمبی سانس بھری، اور میرے اعصاب، جو اب تک ان

چند لمحوں میں ایک اذیت ناک کرب سے تڑپنے لگے تھے، یکا یک پھول کی طرح ہلکے ہو گئے۔ یہ چہرہ تو کسی اور عورت کا چہرہ تھا، وہ دور کی مشابہت اب ختم ہو چکی تھی۔ یہ بھی کوئی امیر اور رئیس عورت تھی، جو اپنی جوانی میں بے حد خوبصورت رہی ہو گی، مگر اب تو یہ چہرہ ایک ادھیڑ عمر عورت کا چہرہ تھا۔ میرے قریب سے آنکھیں جھکائے، نگاہیں سیڑھیوں کے پتھروں پر جمائے، وہ نیچے اتر گئی، اور میں اوپر چڑھنے لگی۔ اوپر چڑھتے چڑھتے تیز تیز قدموں سے میں نے کنور جی کو جا لیا اور جاتے ہی اُن کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''انہوں نے مجھ سے آنکھیں چرا کر اوپر مندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''چند لمحوں کے لیے میں حیران رہ گیا اُس عورت کو دیکھ کر..... چاچی جی یہاں کیسے آ گئیں! وہ تو دلّی میں ہیں، اور بیمار ہیں..... چاچی جی!.....'' وہ منہ ہی منہ میں بڑ بڑانے لگے، میں چپ رہی۔

''دیول گاؤں سے واپس آ کر ہم لوگ ہنی مون منانے نینی تال چلے گئے۔ حالانکہ ہمارے علاقے میں بھی کئی پُر فضا پہاڑی مقام ہیں، مگر میں اُن جانے پہچانے علاقوں سے کہیں دور جانا چاہتی تھی، جہاں کی فضا ہم دونوں کے لیے اجنبی ہو، جہاں کے ماحول میں اُنہیں اُرملا کی یاد نہ ستائے، یا اِس قدر تو نہ ستائے جس قدر یہاں اُس کی یادوں میں رچے بسے ماحول میں ستاتی ہے۔

''چائنا پیک کی طرف جاتے ہوئے دیواروں سے گھرے ہوئے راجا پام پور

کا ایک کاٹج نما محل ہمیں رہنے کو مل گیا، جس کے چھتے ہوئے برآمدے کی چوبی محرابوں سے لپٹی ہوئی بیلوں میں زرد گلاب کھلے ہوئے تھے، جہاں ہم صبح بیٹھ کر ناشتا کرتے تھے، جہاں سے نیچے نینی تال کی حسین وادی کا سارا منظر دکھائی دیتا تھا۔ چاروں طرف سے مدوّر گھاٹیوں نے نیچے اتر کر ایک چھوٹی سی جھیل کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا، اور سر بہ فلک گھاٹیوں کے سرسبز جنگلوں میں خوش نما کوٹھیاں شریر بچوں کی طرح اِدھر اُدھر چھپی ہوئی تھیں۔

کبھی بادل لہرا کر جو نیچے اتر آتے تو زمین ہماری نگاہوں سے کٹ جاتی، اور ایسا لگتا جیسے ہماری کاٹج ہَوا کے دوش پر، یا اَلف لیلہ کے کسی جن کی ہتھیلی پر اُڑ رہی ہے، اور عجیب عجیب سی کویتائیں میرے دماغ میں آنے لگتیں۔

''وہ کہتا، 'یہ کہتے ہوئے مجھے حیرت ہوتی ہے، تمہارے جیسی چٹان کی طرح مضبوط عورت شاعری کیسے کر لیتی ہے؟''

''میں کہتی، 'مگر چٹان میں دراڑیں بھی تو ہوتی ہیں، جہاں سبزہ اُگتا ہے''۔

''رات کو اطلسی صوفوں والے ڈرائنگ روم میں سونے سے پہلے وہ مجھ سے میری کویتا سنا کرتے تھے۔ ڈرائنگ روم کی بتیاں گُل کر دی جاتیں، صرف نیلے بلور کا ایک چھوٹا سا فانوس میرے سر کے اوپر روشن رہتا۔ اُس کی ہلکی ہلکی، نیلی نیلی روشنی چھن کر میرے لباس پر پڑتی رہتی، اور میری کویتا کے کاغذ پر، اور میں کویتا میں کھوئی ہوئی اُنہیں سناتی رہتی، اور وہ میرے بائیں طرف میرے صوفے سے ہٹ کر اپنی کرسی کھسکا

کر ذرا پرے اس طرح بیٹھتے تھے کہ میں اُنہیں نہیں دیکھ سکتی تھی، صرف وہ مجھے دیکھ سکتے تھے، اور وہ بھی میرا دایاں رخ، اور رخ کا بھی ایک حصہ، یعنی کالے بالوں کی لہراتی ہوئی ایک زلف، کان کی ایک لَو زلف میں گرہ گیر، اور دائیں رخسار کا ایک حصّہ.....بس اِتنا ہی اُنہیں نظر آتا تھا، اور مجھے جب دیکھنا ہوتا تو پلٹ کر انہیں دیکھ سکتی تھی۔

''کویتا سننے کا یہ کیا طریقہ ہے!'' میں اُن سے کہتی، ''سامنے آ کے بیٹھو۔''

''سامنے آ کے بیٹھوں گا تو چہرے میں کھو جاؤں گا۔'' وہ مسکرا کر کہتے، ''مجھے یہیں سے سننا اچھا لگتا ہے، آواز بھی صاف آتی ہے، اور یہ نیلی روشنی جو چھن کر تمہارے لباس پر اترتی ہے، اس سے تم آسمان کی پری معلوم ہوتی ہو۔'

ایسی تعریف تو انہوں نے کبھی نہیں کی تھی، اور یہ تعریف اوپری بھی نہ تھی، آواز میں گہری شدت تھی اور ایک غم آشنا خلوص، جو مجھے چھوئے بغیر نہ رہا۔

''اب میں ہر روز وہیں اُسی طرح بیٹھتی تھی، جہاں مجھے وہ بیٹھنے کے لیے کہتے تھے، اور میں وہی کویتائیں سناتی تھی جو انہیں پسند تھیں۔ وہ اُس جگہ بیٹھتے تھے جو انہیں اس درجہ پسند تھی۔ کویتا سنتے سنتے وہ کھوئے ہوئے انداز میں پیچھے سے چل کر میرے قریب آ جاتے، مجھے بے اختیار صوفے سے اٹھا کر اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتے اور خواب گاہ کی طرف چلنے لگتے۔ اُس وقت میں اُن کے سینے کی پرشور دھڑکن صاف سن سکتی تھی۔ میری کویتا جیسے اُن پر جادو کر دیتی تھی، اور وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتے تھے، اور مجھے سینے سے لگائے بہت بہت پیار کرتے تھے۔ میں مدہوش سی ہو جاتی تھی۔

''میں کویتا سناتے سناتے مڑ کر نہیں دیکھتی تھی، کیوں کہ انہوں نے منع کر رکھا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ خود جگہ جگہ داد دیتے جاتے تھے، جیسے مجھے آسرا دے رہے ہوں، 'تم پڑھو، میں تمہارے ساتھ ہوں..... تم اپنی کویتا کے سہارے چلو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔' اور اُن کی وہ بھاری مردانہ آواز جیسے میری آواز کی کمر میں ہاتھ دے کر اُسے کویتا کی سیڑھیوں پر اوپر چڑھا رہی ہو۔

''مگر ایک دن ایسا لگا جیسے وہ بہت عرصے سے خاموش ہیں۔ میری کویتا بھی طویل تھی، میں نے محسوس کیا، جیسے وہ ہنکارا نہیں بھر رہے ہیں۔ اُن کی طویل خاموشی سے پریشان ہو کر مجھے خیال ہوا، شاید وہ کویتا سنتے سنتے سو گئے ہیں، یا اکتا رہے ہیں۔ میں نے ذرا سا پلٹ کر جو انہیں دیکھا تو وہ وہیں بیٹھے تھے، اُسی صوفے پر، اُسی انداز میں، آنکھیں کھلیں، مگر میرے رخ میں ڈوبی ہوئی، کھوئی ہوئی، اُن کا پورا وجود اُس وقت میری آواز کی دسترس سے بہت دور کہیں جا چکا تھا۔

''میں نے جلدی سے اپنا پورا چہرہ اُن کی طرف پلٹ دیا، اور کچھ کہنے ہی والی تھی کہ یکا یک اُن کی جامد وساکت، بڑی، ڈوبی پتلیوں میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ وہ کھوئی ہوئی، وہ خوابوں میں کسی کو تلاش کرنے والی نگاہیں ابھر کر سطح پر آ گئیں۔ وہ چونک گئے، اور حیرت سے اس طرح میری طرف دیکھنے لگے جیسے اپنے سامنے کسی اجنبی کو دیکھ رہے ہوں..... پہلی بار!

''کہاں تھے؟' میں نے کسی قدر تلخی سے کہا، 'کویتا نہیں سن رہے ہو؟''

''ڈارلنگ.....' وہ اپنی پُرکشش مسکراہٹ واپس لاتے ہوئے بولے، 'میں تمہیں دیکھ رہا تھا..... تمہارا یہ رخ مجھے بہت پسند ہے..... بہت ہی پسند ہے!''

''ایک روز میں نے ایک تجربہ کیا۔ اُس روز میں کالج میں اکیلی تھی، وہ نیچے یاٹ کلب میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے کسی انگریز سے ملنے چلے گئے تھے۔ بادل گھر آئے تھے، چاروں طرف ایک بھورا سا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اُس وقت یکا یک مجھے ایک خیال آیا، میں نے ڈرائنگ روم میں گھس کر ساری کھڑکیاں بند کر دیں، سارے پردے گرا دیے اور ڈرائنگ روم میں جب تقریباً رات کا سماں ہو گیا تو اپنے سر کے اوپر صوفے کے پیچھے وہی نیلے کانچ والا فانوس روشن کیا، پھر میں نے اپنی پرانی بوڑھی کھلائی امن چین کو ڈرائنگ روم میں بلایا، اور اُسے اُسی جگہ، اُسی زاویے پر، اُسی کرسی پر بٹھایا جہاں کویتا سنتے وقت کنور جی بیٹھے تھے۔ 'امن چین! سن لے کان کھول کے، دھیان سے میری بات سن، میں وہاں بیٹھتی ہوں، اُس صوفے پر تجھ سے تقریباً پیٹھ کر کے اور کویتا پڑھتی ہوں، تو یہاں بیٹھ کے مجھے دیکھ، اور بتا کہ میں واقعی اِس جگہ سے بہت سندر جان پڑتی ہوں؟'

''امن چین کو میری عجیب وغریب خواہش پر بڑا تعجب ہوا۔ اُس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے کہا، 'آپ تو ہر طرح سے سندر لگتی ہیں۔''

''میں نے کہا، امن چین! بک بک نہ کر، بس وہیں بیٹھ جا جہاں میں تجھے بٹھاتی ہوں، اور میں اِس صوفے پر بیٹھ کر کویتا پڑھتی ہوں، اور تیری طرف اتنی پیٹھ کر

کے بیٹھوں گی کہ تجھے یہ زلف اور یہ کان کی لَو اور چہرے کا بس اتنا ہی حصہ دائیں طرف سے نظر آئے گا، پھر جب میں کویتا پڑھنے لگوں گی تو بتائیو!''

''امن چین کنور جی کی جگہ بیٹھ گئی، اُسی زاویے سے میں اپنے صوفے پر بیٹھی۔ میں نے اپنے سر کے اوپر نیلا، بلور والا فانوس صحیح جگہ پر رکھا، اور کاغذات ہاتھ میں لے کے اپنے زاویے پر بیٹھ گئی، پھر میں نے اُس سے پوچھا، 'امن چین! میں ٹھیک بیٹھی ہوں کیا؟''

''نہیں.....' امن چین بولی، 'تھوڑا سا اُدھر گھوم جاؤ بٹیا!'

''اب؟.....''

''تھوڑا اور!''

''اب؟.....''

''ہاں، بس اب ٹھیک ہے۔''

''میں نے کاغذ کھول کر، سر تھوڑا سا جھکا کر، بالکل اُسی زاویے میں کویتا پڑھنی شروع کی، جس زاویے میں کنور جی مجھے دیکھنے کے عادی تھے۔

''یکا یک امن چین نے 'ہائے' کہہ کے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیے۔ میں تیزی سے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے؟' میں نے پوچھا۔

''ہائے! بالکل اُرملا لگتی ہو!' امن چین ہانپتی ہوئی بولی۔

''اُس رات میں نے کنور جی کو کویتا نہیں سنائی۔

کھانے کی میز سے اٹھتے ہی میں نے سر درد کا بہانہ کر لیا، اور جا کے سیدھے اپنے بستر پر پڑ گئی۔ کنور جی یکا فی روم سے کافی پی کر آئے، اُنہوں نے مجھے اپنی بانہوں میں لینا چاہا، مگر میں نے انکار کر دیا اور لحاف اچھی طرح اپنے چاروں طرف لپیٹ کر پڑ گئی۔

کنور جی کچھ دیر تک جاگتے رہے، کروٹ بدلتے رہے، لیمپ جلا کر رنگین تصویروں والے رسالے دیکھتے رہے، پھر بتی بجھا کر سو گئے۔

کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ آج ہوا تیز تھی بادل کی گرج بھی، اور کبھی کبھی دریچوں پر پڑنے والی تیز بارش کی بوچھاڑ یوں لگتی جیسے کوئی میرے رخسار پر تڑاتڑ طمانچے مار رہا ہو۔

''اب مجھے کیا معلوم تھا کہ اُرملا کو مار کر بھی میں خود اپنے اندر اُرملا کو زندہ رکھوں گی۔ وہ خود میری ہی ہستی میں کہیں نہ کہیں چھپ کر زندہ رہے گی، کبھی میرے رخ کے کسی زاویے میں، کبھی میری چال کی کسی ادا میں، کبھی میری آواز کے کسی سُر میں..... یعنی کوئی مجھ میں کسی اور کو دیکھے گا، اور میری آواز سن کر کسی دوسری آواز کو یاد کرے گا، اور مجھے اپنی بانہوں میں لے کر کسی اور سے پیار کرے گا! اس قدر خوف ناک جنم کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا، میں نے سمجھا تھا، میں نے دیول گاؤں کو پا لیا۔ آج معلوم ہوا کہ دیول مجھ سے آج بھی اتنی ہی دور ہے جتنا پہلے دن تھا، اور میری حالت تو

اُس برہمن ندی کی سی ہے جو دیول سے بہت دور اُس کے قدموں کے گرد چکر کاٹتی ہے، اور سر پٹک کر وہیں پر رہ جاتی ہے۔ اچھا، اگر یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ کنور راج! تم میری بانہوں میں عاشق کی طرح نہیں آؤ گے تو میں تمہیں اِن بانہوں میں قیدی بنا کر رکھوں گی، مگر تم میرے جیتے جی میری بانہوں کے حصار سے کبھی آزاد نہ ہو گے۔ میرا بھی یہی فیصلہ ہے۔ قیدی بھی جیل کی دیواروں سے مانوس ہو جاتا ہے، ایک دن تم بھی مجھ سے مانوس ہو جاؤ گے، اور جب تمہیں میری عادت پڑ جائے گی تو شاید محبت بھی ہو جائے۔ کنور راج! میں بہت مضبوط عورت ہوں۔ جو طمانچے تم میرے رخسار پر مارے رہے ہو، اُن کے باوجود میں روؤں گی نہیں۔ کنور راج میں تمہیں جیت کے رہوں گی۔''

اتنا کہہ کر رانی جی چپ ہو گئیں، کمرے میں ایک طویل سناٹا چھا گیا۔

میں نے پوچھا، ''مگر کیا ایک بار بھی انہیں شک نہیں گزرا آپ پر؟..... اُرملا کے سلسلے میں.....'' میں نے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے فقرہ ناتمام چھوڑ دیا۔

''نہیں۔'' رانی جی نے جواب دیا، ''میں خود اس سلسلے میں جاننے کے لیے بہت بے چین رہتی تھی، اور شروع کے کئی ماہ، بلکہ کئی سال میرے دل میں یہ شبہ گزرتا رہا، جیسے انہیں معلوم ہے، جیسے وہ کچھ جانتے ہیں، مگر نہیں، میرا اندازہ غلط تھا۔ انہیں مطلق کچھ معلوم نہ تھا، کوئی شبہ نہ تھا۔ کبھی کسی خفیف سے خفیف حرکت سے انہوں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ اُنہیں میرے بارے میں کسی طرح کا شبہ ہے..... ہاں، اگر شادی سے پہلے میں نے کبھی اُن سے اظہارِ محبت کیا ہوتا، میرے اُن کے درمیان کوئی ایک ایسی نگاہ

بھی گزری ہوتی جس میں ہم دونوں کی وہ قربت شامل ہوتی جو ایک دوسرے کو محبت کے قریب لے جاتی ہے، تو ممکن ہے، اُن کے دل میں شبہے کا شائبہ سا گزرتا، مگر یہاں شبہہ کرنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔''

''اور دنیا؟.....'' میں نے پوچھا۔

''دنیا بھی کیسے شبہہ کر سکتی تھی! میں بڑی بہن تھی، راج پاٹ کی جائز حق دار۔ وہ میری چھوٹی بہن تھی۔ قاعدے سے اُسے میرے خلاف سازش کرنی چاہیے تھی، اِس لیے دنیا کی نظر میں مَیں قطعاً معصوم تھی، پھر میں اُسے کس قدر چاہتی تھی، یہ بھی دنیا جانتی تھی۔ کس طرح سے وہ میرے رستے میں حائل تھی، اِس کا دنیا کو کیا، خود اُرملا کو کوئی اندازہ نہ تھا، اور اُسے اپنے راستے سے ہٹا دینے کا میں نے کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا۔ اُسے دھکا دینے سے پہلے میں خود نہیں جانتی تھی کہ میں ایسا کروں گے۔ وہ تو ایک لمحے کی اضطراری حرکت تھی۔

''ہم چھ مہینے ہرگاؤں میں رہتے تھے، چھے مہینے زرگانو میں، مگر ہم کہیں بھی ہوں، اُرملا کی برسی منانے کے لیے ہم ضرور زرگاؤں کی گڑھی میں آ جاتے، اور تنگ کے اُس پرانے پیڑ کے نیچے چند گھنٹے اُس کی یاد میں صَرف کرتے۔''

''کچھ عجیب سا نہیں لگتا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''شروع شروع میں لگتا تھا۔ ڈرتی تھی، اپنی کسی حرکت سے راز افشا نہ کر دوں، مگر میں آہنی ارادے والی عورت ہوں، میں نہ جھک سکتی ہوں، نہ ٹوٹ سکتی ہوں۔

مجھے اپنی طبیعت پر مکمل قابو ہے اور ہر سال میں چند گھنٹے ہی تو ہوتے تھے ورنہ ہم دونوں اُس پائیں باغ میں جانے سے احتراز ہی کرتے تھے۔''

''اُرملا کبھی آپ کے خواب میں آئی؟''

''نہیں، آج تک نہیں آئی۔'' رانی جی قطعیت سے بولیں، ''مجھے خواب نہیں آتے۔''

''عجیب بات ہے!''

''ہاں ہے تو عجیب......'' وہ بولی، ''مگر سچ تو یہی ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، کوئی خواب نہیں دیکھا......صاف گہری نیند آتی ہے۔''

''رات کی تاریکی میں، اُس کے سُونے اور اکیلے پن میں آپ نے کبھی یوں محسوس نہیں کیا جیسے اُرملا آپ کے پیچھے کھڑی ہے، گہرے گہرے سانس لے رہی ہے، یا تاریکی میں اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے آپ کو گھور رہی ہے؟''

اُس نے آہستہ سے انکار میں سر ہلایا اور دھیرے سے مسکرا کر کہنے لگی، ''ڈاکٹر گھوش! میں وہمی عورت نہیں ہوں، مجھے خواب نہیں آتے، میں تاریکی سے نہیں ڈرتی، میں رات رات بھر اکیلی جنگل میں مچان پر رہ سکتی ہوں، میرے ہاتھ کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔ میرا دل بہت مضبوط ہے۔''

میں چند لمحے اُسے غور سے دیکھتا رہا، اُس کی گہری سبز آنکھیں کسی پُر اسرار سمندر کی طرح اتھاہ تھیں۔ جوانی میں یہ عورت بے حد خطرناک اور خوبصورت رہی

ہوگی۔ اِن آنکھوں میں کوئی بھی ڈوب سکتا ہے۔

میں نے کہا، ''اگر اجازت ہو تو ایک سگار سلگا لوں، میں اتنی دیر سگار کے بغیر نہیں بیٹھ سکتا۔''

میں سگار سلگانے کے بعد ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ میرے چہرے کی الجھن دیکھ کے بولی، ''سننے سے پہلے کچھ پوچھنا چاہتے ہو شاید۔''

میں نے سگار کے دو تین کش جلدی لیے، اور آنکھیں ایش ٹرے پر جھکا کر بولا، ''سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے کوئی عجیب بات نہیں ہوئی، کبھی تو کچھ ضرور ہوا ہوگا۔ قتل ذاتی ہو یا میدان جنگ میں ہمیشہ کہیں نہ کہیں اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے، اور چھوڑتا رہتا ہے اور اپنی ہستی کا ثبوت دیتا رہتا ہے۔ ہر قتل کی اپنی ایک زندہ متحرک ہستی ہوتی ہے۔ قاتل اور مقتول سے الگ اُس کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے، قتل ہمیشہ بولتا ہے، اور اُسے کبھی موت کے گھاٹ نہیں اتارا جا سکتا۔ قاتل اور مقتول کے مرنے کے بعد بھی قتل زندہ رہتا ہے، وہ جگہ بولتی ہے جہاں قتل ہوا تھا۔ وہ ہوا کراہتی ہے، جس کی فضا میں کسی کا گلا گھونٹا گیا تھا، لہو دھو دینے کے بعد بھی خنجر کی زبان ہانپتی ہے۔''

''تم کیسی خوفناک باتیں کرتے ہو ڈاکٹر!'' وہ رک رک کر بولی، میں نے دیکھا، اُس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا، تقریباً سفید ہو چلا تھا، گلے کی رگیں کھنچ آئیں تھیں۔ میں چپ رہا، پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اپنی طبیعت پر اُس نے قابو پا لیا۔ واقعی غضب کی آہنی ارادے والی عورت تھی۔ میں دیکھ سکتا تھا، اُسے خود پر قابو پانے کے لیے

کتنی جاں کاہ کاوش کرنی پڑ رہی تھی۔ میں اُسے توڑ دینا چاہتا تھا، مگر وہ ٹوٹی نہیں۔ چند ہی لمحوں میں اُس کا چہرہ نارمل دکھائی دینے لگا، اُس کی آواز بھی اصلی حالت میں واپس آ گئی، وہ کہنے لگی، ''بیس برس کی شادی شدہ زندگی ایک عمر ہوتی ہے ڈاکٹر گھوش! یہ بیس برس بہت خوش وخرم گزرے کبھی کوئی ناگوار بات ایک دوسرے سے نہیں ہوئی۔ میں وہ والہانہ محبت تو حاصل نہیں کر سکتی تھی جو انہوں نے اُرملا کو دی تھی۔ ہاں! مگر پھر بھی ایک گہری سمجھ، قربت، رفاقت اور جسم کی دلدار محبت، بہت کچھ دیا اُن بیس برسوں میں ہم لوگ ساتھ رہے، بیس برس بہت گھومے، یورپ گھومے، دنیا گھومے۔ عزت، دولت، شہرت، حکومت .....سب کچھ ہمارے پاس تھا، کبھی کسی چیز کی کمی نہیں رہی۔ ہولے ہولے میں بھول گئی کہ اُرملا نام کی میری کوئی بہن بھی تھی۔ ہولے ہولے شاید وہ بھی بھول گئے ہوں گے۔ ایسا اُن کے برتاؤ سے ہمیشہ میں نے سمجھا.....مگر اُن بیس برسوں میں ایک عجیب بات ضرور ہوئی، اُن بیس برسوں میں میرے پانچ بچے ہوئے اور پانچوں کے پانچوں مر گئے۔''

میں نے چونک کر رانی کی طرف دیکھا، مگر اُس کا چہرہ اُس وقت ایک مکمل نقاب تھا۔ ''بہترین اداکارہ ہے یہ عورت!'' میں نے اپنے دل میں سوچا، اور یہ سوچ کر میرے دل میں ایک سرد جھرجھری سی دوڑ گئی۔

''کیا پانچوں لڑکے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں..... پہلے چار لڑکے ہوئے، پانچویں لڑکی تھی۔ لڑکے تو دو دو، تین تین

سال کے ہو جاتے تھے مگر لڑکی تو ڈیڑھ برس کی ہو کے مر گئی، اُس کی شکل ہو بہو اُرملا سے ملتی تھی۔''

میں نے پھر چونک کے اُس کی طرف دیکھا، مگر وہاں پھر کچھ نہ تھا، محض ایک نقاب تھا۔ وہ کہہ رہی تھی، ''کنور جی اسے بہت چاہتے تھے، ہر وقت اُسے اٹھائے پھرتے تھے۔ جب وہ چھ ماہ کی ہو گئی تو ہر روز اپنے ساتھ بستر پر سلاتے تھے، اپنے ہاتھ سے اُسے نہلاتے دُھلاتے، کپڑے پہناتے، کھانا کھلاتے کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ وہ دنیا کو بھول گئے، خود کو بھول گئے، مجھے بھول گئے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اُس بچی کے لیے ساری دنیا ترک کر دیں گے۔ مجھے اُس بچی سے نفرت ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اُرملا نے مجھے جلانے کے لیے میری ہی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

''یہی تو مصیبت تھی، میں خود ہی اُس بچی کو وہ محبت نہ دے سکتی جو اُس سے پہلے پیدا ہونے والے چار بچوں کو میں نے دی تھی۔ ممکن ہے دیتی، اگر اُس کی صورت اُرملا سے اس قدر مشابہہ نہ ہوتی، مگر جوں جوں میری بچی کی شکل نکھرتی جا رہی تھی، میں اُس سے خائف ہوتی جا رہی تھی۔ گو کنور جی کے سامنے، یا دنیا کے سامنے، میں نے کبھی اپنے خوف کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، مگر اُس بچی کو دیکھ کر ہر لمحے خدشہ رہنے لگا کہ ابھی کوئی بری بات ہونے والی ہے، ابھی کوئی بری بات ہونے والی ہے..... ہر وقت دل دھک دھک کرتا رہتا۔

''وہ بڑی عجیب وغریب بچی تھی۔ ایک بار میں پرانی تصویروں کا البم کھولے

دیکھ رہی تھی کہ وہ بھی گھسٹتی گھسٹتی میرے قریب آ گئی اور تصویریں دیکھنے لگی۔ اتفاقاً سامنے اُرملا کی تصویر آ گئی، میں نے جلدی سے تصویر کو پلٹنا چاہا، مگر اُس نے ہاتھ رکھ دیا اور توتلے لہجے میں بولی، کیوں کہ اب وہ ڈیڑھ سال کی ہو چکی تھی، اور تھوڑا تھوڑا بولنے لگی تھی۔ تصویر پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھنے لگی، ''کون..... کون؟''

''میں نے کہا، ''میری بہن..... بہن.....''

''ایں..... ایں؟'' وہ پوچھنے لگی۔

''ہاں..... میری بہن!''

''وہ جھک کر تصویر پر لیٹ گئی، اور اُرملا کا منہ چومتے ہوئے بولی،

''ایں..... پُو پُو.....''

''یعنی تمہاری بہن اچھی ہے۔ جس چیز کو اچھا کہنا ہوتا، وہ اُسے پُو پُو کہتی تھی۔ ماما پُو پُو، گڑیا پُو پُو، سب پُو پُو تھے، سوائے اُس کے پاپا کے، جو اُس کے اور صرف اُس کے اپنے تھے۔ پاپا 'میلے' (میرے) تھے، باقی سب پُو پُو تھے۔ 'بس پاپا میلے.....'

''عجیب و غریب لڑکی تھی، کبھی کبھی بالکل بڑوں کی طرح مجھے بلاتی تھی۔ ایک بار سردیوں کے دن تھے، وہ بہت دیر سے آئے، میں نے دیر تک انتظار کر کے آخر کھانا کھا لیا، اور بچی کو لے کر خواب گاہ میں چلی گئی۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ وہ کنور جی کے بستر پر سوتی تھی۔ اُس کے پاپا ابھی آئے نہ تھے، مگر اُس نے مجھ سے ضد کی کہ میں اُسے

بستر پر لٹا دوں۔ میں نے کہا، ابھی تمہارے پاپا آئے نہیں ہیں، تم میرے بستر پر سو جاؤ، مگر وہ نہیں مانی، اپنے پاپا کے بستر پر سونے کے لیے اصرار کرتی رہی، اور ہاتھ پیر پٹک کر روتی رہی۔ آخر تھک ہار کر میں نے کھلائی سے کہا کہ اُسے اُن کے بستر پر لٹا دے۔ جب کھلائی اُسے دوسرے بستر پر لٹا کر چلی گئی تو بچی، جو دونوں آنکھیں بند کیے، دم سادھے پڑی تھی، یکا یک آنکھیں کھول کر شرارت سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی، اور اپنی ننھی ننھی بانہوں سے اپنے پاپا کے چھپرکٹ پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگی، 'پاپا میلے..... پاپا میلے۔'

''ہاں ہاں، پاپا تیلے..... پاپا تیلے ہی بھلے..... تو سنبھال، مجھے کیا کرنا ہے تیرے پاپا کو لے کر!'

''ماں..... پاپا میلے!' وہ معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی اور اتنا کہہ کر زور زور سے ہنسنے لگی۔

''ڈاکٹر گھوش! میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ اُس وقت اُس ڈیڑھ سال کی بچی کی وہ نگاہیں کتنی پرانی اور معنی خیز تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے اُرملا مجھے چیلنج دے رہی ہے، براہِ راست میری ہنسی اڑا رہی ہے۔ اُس بچی کے قہقہے میں کتنی تضحیک تھی میرے لیے!..... اور اُس قہقہے کی گونج بالکل اُرملا کے قہقہوں طرح تھی۔''

''یہ آپ کا واہمہ تھا۔'' میں نے رانی جی سے کہا۔ آپ کے حد سے بڑھے ہوئے شبہات نے اُس معصوم بچی کی نگاہوں میں وہ سب پڑھ لیا جو وہاں تھا ہی نہیں۔''

''نہیں، ایسا نہیں۔'' رانی جی قطعیت سے بولیں، ''میں واہموں میں نہیں پڑتی، لیکن نگاہوں کا مطلب بھی خوب جانتی ہوں۔ جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی، میرا دلی ہیجان بڑھ رہا تھا، بڑی ہو کر یہ کیا کرے گی؟ کس طرح مجھ سے انتقام لے گی؟ اب یہی فکر مجھے دن رات کھائے جا رہی تھی۔ ایک تو اس کا میری کوکھ سے پیدا ہونا ہی میرے لیے سوہانِ روح تھا، اور پھر اُسے پالنا، اُسے اپنی بچی کہنا، اور اُس سے پیار کرنے کی کوشش بھی کرنا..... میرے لیے یہ باتیں کس قدر اذیت کا باعث تھیں! میں تمہیں بتا نہیں سکتی، اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس بچی کا کیا کروں؟..... اتنے میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا جس نے مجھے جلد ہی فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔''

''کیا ہوا؟''

''کنور جی کو فلو ہوا۔ فلو، تم جانتے ہو، چھوت کا مرض ہے، بچوں میں بہت جلد سرایت کرتا ہے۔ کنور جی ہر روز بچی کو اپنے ساتھ سلاتے تھے۔ ایک روز کہنے لگے، 'اِسے آج تم اپنے ساتھ سلا لو۔'

''میں نے کہا، 'کھلائی اسے بچوں کے کمرے میں سلا دے گی، خود بھی وہیں سو جائے گی۔' مگر وہ اصرار کرتے رہے کہ میں ہی اُسے ساتھ سلاؤں۔

''مجھے معلوم تھا، کنور جی کو چھوڑ کر وہ کسی طرح میرے سنگ سونے کو تیار نہ ہوگی، اِسی لیے میں منع کر رہی تھی، مگر آخر کو ماں تھی، کب تک انکار کرتی۔ بچی کو اپنے سنگ سلانے پر راضی ہوگی، مگر اب وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ بچی کسی طرح رات کو کنور

جی سے الگ ہونے کو تیار نہ تھی۔ بہت روئی..... بہت غل مچایا اُس نے۔ جب میں نے دھر کے ایک طمانچہ دیا تو سہم کر میرے ساتھ سونے پر تیار ہوگئی۔ دیر تک میرے بستر پر لیٹی سسکتی رہی۔ آخر کار میرے سینے سے لگ کر سو گئی۔

''پھر ایسا ہوا کہ آدھی رات کے وقت مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا، جیسے کسی نے میرے گلے میں پھندا ڈال دیا ہو، اور اب اُسے کس کر میرا گلا گھونٹ رہا ہو۔ میں ہڑبڑا جاگی، اور جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں مکمل اندھیرا تھا، اور میرے پلنگ کے آس پاس کوئی نہ تھا، مگر میرا دم تھا کہ مسلسل گھٹتا جا رہا تھا، سانس بڑی مشکل سے آ رہی تھی۔ یکا یک میرا ہاتھ اپنی گردن پر گیا، اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے گلے میں پڑا ہوا میرے سہاگ کا منگل سوتر، جو ہر وقت میرے گلے میں پڑا رہتا تھا، میری گردن کے گرد بڑی زور سے کس گیا ہے، یا کسی نے کس دیا ہے۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے فوراً روشنی کی تو دیکھا کہ بچی بے خبر میرے سینے سے لگی سو رہی ہے، اُس کا ایک ہاتھ میرے سینے پر ہے، مگر وہ دوسرے ہاتھ سے منگل سوتر کی سنہری زنجیر میری گردن کے گرد کس رہی ہے۔ یہ کم بخت مردار اُرملا کیا سچ مچ اِس بچی کی شکل میں میری جان لینے آئی ہے؟ میں نے بڑی مشکل سے اُس کے ہاتھ سے اپنے منگل سوتر کو اپنی انگلیوں سے علیحدہ کیا۔ اُس چھوٹی بچی کی انگلیوں کی کیسی زبردست پکڑ تھی۔ کس طرح وہ اس منگل سوتر کو اپنی انگلیوں سے علیحدہ کرنے پر تیار نہ تھی، بلکہ اُسے اور کسے جا رہی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کے ایک زوردار جھٹکے سے جب منگل سوتر کو اُس کے ہاتھ سے الگ کیا تو وہ یکا

یک جاگ اٹھی، اور چیخ چیخ کر رونے لگی...... اس قدر روئی کہ کنور جی دوسرے کمرے سے بھاگے بھاگے آئے، اور فلو کے باوجود لڑکی کو اٹھا کر اپنے بستر پر لے گئے۔ میں نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ کم بخت نے آج تو میری جان لی لے لی تھی۔''

''ڈیڑھ سال کی بچی آپ کی جان کیسے لے سکتی تھی رانی صاحبہ؟ وہ تو بچی کا ہاتھ سوتے میں آپ کے منگل سوتر پر پڑ گیا ہوگا، اور نیند میں الجھتا گیا ہوگا۔ ایسی معمولی، فطری سی بات کو آپ اِس قدر پُراسرار رنگ دے رہی ہیں۔''

''اگر آپ کے ساتھ یہی واقعہ اس طرح پیش آتا تو آپ ہرگز یہ نہ کہتے۔ اس واقعے نے، اتفاق نے، حادثے نے، کچھ بھی کہو، مجھے خبردار کر دیا، مجھے اچھی طرح جتا دیا کہ آنے والے شب و روز میں یہ لڑکی کیا رنگ لائے گی۔ ابھی سے ایک طرح اُس نے کنور جی کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ جو کام اُرملا میری بہن بن نہ کر سکی تھی، وہ کام اُس نے میری بچی بن کر پورا کر لیا تھا۔''

میں نے بحث مزید میں الجھنا بے کار سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ رانی جی کی آنکھیں بند تھیں، اور ہونٹ سختی سے اندر کو بھنچے ہوئے تھے، جیسے اب اُنہیں جو کچھ کہنا ہے، وہ اُسے کہنا نہیں چاہتیں، یا کہنا چاہتی ہیں تو اُس کے لیے اُنہیں مناسب الفاظ نہیں ملتے، اور اگر الفاظ ملتے ہیں تو شاید لہجہ نہیں ملتا۔

''پھر؟...'' میں نے پوچھا۔

''پھر... وہ مرگئی۔'' رانی جی نے بڑے ٹھنڈے اور نپے تلے لہجے میں کہا۔

میں چونک کے اُن کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، کیسی غضب کی عورت ہے یہ! اِس نے یہ الفاظ اس طرح ادا کرنے کے لیے اپنی طبیعت پر کتنا جبر کیا ہوگا! اور اس کے لیے کتنا بڑا روحانی تاوان دیا ہوگا! کوئی معمولی عورت یہ الفاظ اس طرح سے ادا نہیں کر سکتی۔ جب لاوا کئی بار کھول کھول کر مرتا ہے تو ایک چٹان تیار ہوتی ہے۔

''کیسے مرگئی؟'' میرے منہ سے نکلا۔

''جیسے بچے مرتے ہیں؛ دو دن بخار ہوتا ہے، تیسرے دن دم توڑ دیتے ہیں۔ بچے تو پھول کی طرح نازک ہوتے ہیں، اُسے کنور جی سے فلو ہو گیا تھا۔''

''کنور جی اس وقت کہاں تھے؟''

''کنور جی بچی میری تحویل میں دے کے گئے تھے صحیح سلامت۔ وہ نہ جاتے، اور اگر جاتے تو بچی کو ساتھ لے جاتے، مگر افتاد ہی ایسی آن پڑی تھی۔ اُن کے چاچا، جو وہ ایک بہت بڑے تعلقے دار تھے، بسترِ مرگ پر پڑے تھے، اور اُنہوں نے سوار بھیج کر کنور جی کو فوراً بلایا تھا... اُنھیں جانا پڑا۔ پہلے تو بہت لیل و لعل کرتے رہے، نہ جانے کتنے بہانے بناتے رہے، مگر، آخر کو بادِل ناخواستہ میرے سمجھانے بجھانے پر چلے گئے۔ اُن کے جاتے ہی بچی کی حالت بگڑنے لگی، دو دن تیز بخار رہا، تیسرے دن مرگئی۔ جب وہ واپس آئے تو غم سے نیم پاگل سے ہو گئے۔ اُس وقت پہلی بار مجھے شبہہ ہی نہیں، یقین ہو گیا کہ وہ اُرملا کو کبھی نہیں بھولے تھے، کبھی بھول بھی نہیں سکیں گے... میری ہر کاوش بے کار تھی۔''

وہ چپ ہوگئی، مگر اس کا سارا جسم مرتعش تھا، کسی اندرونی زلزلے سے کانپ رہا تھا۔ وہ دیر تک چپ رہی، اور دیر تک میری توجہ اپنے سگار پر رہی اور میں کچھ نہیں بولا، کیوں کہ میں کہانی سننے والا تھا... میں کیا کہہ سکتا تھا۔

بہت دیر بعد وہ بولی، ''اب وقت کیا ہوگا؟''

میں نے گھڑی دیکھ کر کہا، ''چھ بجنے میں آدھا گھنٹا باقی ہے۔''

''وقت قریب آرہا ہے۔'' وہ بڑے پُراسرار لہجے میں بولی۔

''کاہے کا؟'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

''ابھی تھوڑی دیر میں تم سب جان جاؤ گے۔'' وہ مجھے تسلی دیتی ہوئی بولی، ''جلدی مت کرو، ابھی سب جان لوگے، اب میں کہانی کے آخری حصے پر پہنچ رہی ہوں۔''

''آگے چلنے سے پہلے ایک بات پوچھ لوں؟ وہ لڑکی خودمری تھی، یا ماری گئی تھی؟...''

معاً اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیے۔ چند لمحوں کیلئے وہ اس طرح کانپی، جیسے طوفان کی زد پر آیا ہوا پتہ کانپتا ہے، پھر یکا یک ساکت ہوگئی، بڑے نپے تلے لہجے میں رک رک کر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے وہ کہنے لگی، ''میں تم سے کہہ چکی ہوں؛ میں نہ جھک سکتی ہوں، نہ ٹوٹ سکتی ہوں!

''بچی کے مرنے کے بعد چند دن تک کنور جی نیم پاگل سے رہے، پھر رفتہ رفتہ

انھوں نے خود کو سنبھال لیا، وہ اپنے کاموں میں مشغول رہنے لگے۔ بہ دستور سابق میری دلداری کرنے لگے۔ انھوں نے ہر اس تبدیلی کو مٹا ڈالا، جو گذشتہ ڈیڑھ سال میں بچی کی حیاتِ چند روزہ ان کے لیے لائی تھی، مگر اتنا میں نے ضرور محسوس کیا، جیسے وہ بجھ سے گئے ہیں، غائب سے رہنے لگے ہیں۔ تمام دلچسپیوں، گھریلو مشاغل اور میری طرف سے شدید محبت کے اظہار کے باوجود اندر ہی اندر کہیں گم رہنے لگے ہیں۔ میں بہت سٹپٹائی، طرح طرح کی کوششوں سے میں نے ان کا دل لگانا چاہا مگر ہر بات میں ان کی دلچسپی اوپری تھی۔ میں تم سے کہتی ہوں کہ ہزار دنیا دار ہونے کے باوجود وہ بہت معصوم آدمی تھے۔ بھروسا کرنا ان کی فطرت تھی، اور شبہہ کرنا ان کی عادت، مگر پہلی دفعہ میں نے دیکھا کہ ان کی صاف، اجلی نگاہ میری طرف دیکھتے ہی اب دھواں دھواں سی ہونے لگی تھی۔ ایک عجیب بے چین، مضطرب کھولتا ہوا گدلا پن ان میں آجاتا تھا، اور وہ جلدی سے ان نگاہوں کو چھپانے کے لیے آنکھیں جھکا لیتے تھے، یا اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے تھے، مگر ان کی ذہنی حالت سے میں بے خبر نہ تھی، اور ان کی طرف سے پریشان رہنے لگی تھی۔

''لڑکی کی موت کے بعد کنور راج میں گہری تبدیلی آئی۔ ان کا مزاج تنہائی پسند ہوتا چلا گیا، وہ اکیلے رہنے کو دوسروں کے ساتھ رہنے پر ترجیح دینے لگے۔ اس سے پہلے وہ خاصے مجلسی تھے۔ انھیں لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، چہل کرنا، شکار پر جانا، رات گئے دیر تک محفل جمانا، غرضیکہ بے فکر رؤسا کے سارے مشاغل انھیں بے حد پسند تھے۔ ایک ایک کر کے وہ سارے مشاغل انھیں چھوڑتے گئے، اور لوگوں سے کٹ کر

اکیلے ہوتے گئے، راج دربار کے کاموں میں ڈھیل ڈالنے لگے۔ بحث مباحثے کے وقت اکثر چپ ہی رہتے...ایسا لگتا تھا کہ جیسے بہت سی باتوں سے ان کی دلچسپی ایک دم غائب ہوگئی ہے۔

''اِس سے پہلے ہم دونوں دن بھر ساتھ رہا کرتے تھے، وقت کا خاصا حصہ اکھٹے گزرتا تھا، زنانے میں بھی بہت آتے تھے۔ اب دن بھر نہیں آتے تھے۔ ہولے ہولے رات کو بھی دیر سے آنے لگے۔ کچھ عجیب سا عمل ہوگیا تھا۔ ان سے بات کرو تو آدھی بات کا جواب دیتے تھے، آدھی گول کر جاتے تھے۔ زیادہ سوال کرو تو چپ ہو جاتے، کوئی بحث چھیڑو تو بظاہر دلچسپی لیتے ہوئے، اندر ہی اندر کہیں غائب ہو جاتے۔ بہت دیر کے بعد مجھے پتا چلتا کہ میں بے کار کی جھک مار رہی تھی، وہ تو سن ہی نہیں رہے تھے۔ ان باتوں سے طبیعت بہت الجھنے لگی تھی۔

''پھر اکھٹے تین دن تین راتیں، وہ زنانے میں نہیں آئے، میں بہت پریشان ہوگئی، اور تین دن کے بعد جب انھیں دیکھا تو اور بھی پریشان ہوگئی۔ داڑھی بڑھی ہوئی، ماتھے پر شکنیں، چہرہ سوچ میں ڈوبا ہوا...ایسا لگتا تھا جیسے وہ تین دن سے نہ نہائے ہیں، نہ کپڑے بدلے ہیں۔

''یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟' آخر میں نے بھی اس امر کا فیصلہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔' آئینے میں اپنا آپ دیکھیے۔'

''دیکھ لیا...' وہ بیزاری سے بولے،' اس محل کے سارے آئینے غلط ہیں۔'

''غلط ہیں؟...'

''ہاں...جو میں ہوں، وہ یہ نہیں دکھاتے، اور جو دکھاتے ہیں، وہ میں نہیں ہوں۔'

''تو کیا کرنا چاہیے؟''

''تم بھی آئینے میں مت دیکھا کرو۔ اس محل کے سارے آئینے جھوٹ بولتے ہیں۔''

''تین دن سے آپ زنانے میں نہیں آئے، مجھ سے نہیں ملے۔ لوگوں میں چہ گوئیاں شروع ہوگئی ہیں''۔

''مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔''

''پروا تو مجھے بھی نہیں ہے، مگر زندگی نے جو مرتبہ ہمیں دیا ہے، اس کے تقاضے یہی کہتے ہیں کہ آداب کو کسی صورت میں ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔''

''اور آداب کیا کہتے ہیں؟'

''آپ کو روز رات کو زنانے میں آنا چاہیے۔ ناشتے کے وقت ناشتا، کھانے کے وقت کھانا، اور راج دربار کے کام کے وقت راج دربار کا کام کرنا چاہیے۔ آپ کی ایک بیوی ہے۔''

''اوہ!' کہہ کر وہ ہنسے۔ بڑھی ہوئی داڑھی میں مجھے ان کی ہنسی، ان کا چہرہ، ان کی سوچ میں ڈوبی ہوئی محزوں مسکراہٹ بہت اچھی لگی...ایسا لگا جیسے وہ اجنبی ہوں،

اور آج پہلی مرتبہ میرے راج محل میں آئے ہوں۔ میرا دل پہلی رات کی طرح ان کے لیے دھک دھک کرنے لگا۔ میں لڑائی کرنے آئی تھی، مگر ان کی مسکراہٹ دیکھ کر سارا غصہ کافور ہوگیا۔ میں بے اختیار ان کے پاس چلی گئی۔ انھوں نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ان کے جسم سے عجیب سی خوشبو آرہی تھی۔

''یہ کیسی خوشبو ہے؟' میں نے ان کی بانہیں، ان کا کندھا، ان کا سینہ جگہ جگہ سے سونگھ کر کہا۔

''چندن کی خوشبو ہے۔''

''ہاں...' میں نے سونگھ کر کہا، ''ہاں چندن ہی تو ہے، مگر کیوں؟'

''ایک تجربہ کررہا ہوں۔'' وہ عجیب لہجے میں بولے

''کیسا تجربہ؟...''

''جب مکمل ہوجائے گا تو بتاؤں گا۔''

''میں تو ابھی معلوم کرنا چاہتی ہوں۔''

''ابھی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں!''

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے، اور پھر چار روز تک نہیں آئے۔

اتنا مجھ معلوم تھا کہ وہ ہیں گڑھی میں۔ انھوں نے گڑھی کے سب سے اوپر اور سب سے اونچے حصے میں، جسے ہم 'ٹاور' کہتے ہیں، اپنا کمرا بنالیا تھا، اور اسی میں خود کو دن رات بند رکھتے تھے، اور وہاں سے رات دن عجیب عجیب سی آوازیں آتی تھیں۔

'ٹھک ٹھک' ہوتی، 'کھٹ کھٹ' ہوتی۔ کبھی آری کے چلنے، کبھی ضرب لگنے، کبھی کیل گاڑنے، کبھی چھیلنے کی آوازیں آتیں۔ چندن کی لکڑیاں چُن چُن کر منگائی جاتی تھیں۔ رنگ اور برش اور خوبصورت کپڑے، خوبصورت اور رنگین اور مختلف طرح کی چیزیں، دریں شب و روز پہنچائی جاتی تھیں۔ اتنا تو میں نے معلوم کرلیا، مگر سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس طرح کا تجربہ کررہے تھے۔ میں چاہتی تو سیدھی اوپر ٹاور میں جا کر خود معلوم کرسکتی تھی، مگر مناسب معلوم نہ ہوا، اگر وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہتے ہیں تو چھپاتے رہیں، میری جوتی کو پڑی ہے جو معلوم کرنے کی کوشش کروں!

''مگر چار روز بعد جب وہ آئے تو پہلے سے بھی زیادہ غائب اور سوچ میں ڈوبے ہوئے، داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا، وہ بھی میلا تھا، کالر مڑے ہوئے تھے، اور بدن پر، اور کپڑوں پر، جگہ جگہ چندن کا برادہ نظر آرہا تھا۔

''کیا چندن سے کوئی دوا بنا رہے ہو؟' میں نے تنگ کر پوچھا۔

''دل کی دوا...'' وہ مسکرا کر بولے۔

''کس کے دل کی دوا...اپنے دل کی؟ یا میرے دل کی؟'

''دونوں کے دل کی۔'

''مرض کی نوعیت کیا ہے؟'

''یہی تو معلوم نہیں!' وہ آہ بھر کے بولے۔

''تمھیں ہوکیا گیا ہے؟''

''یہی تو معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

''کب تک داڑھی بڑھاتے چلے جاؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی جواب نہیں ملا۔''

'''کب تک راتوں کو محل سے باہر رہو گے؟''

''پھر کوئی جواب نہیں ملا۔''

'''شاید تم اب مجھ سے پیار نہیں کرتے۔' میرے دل کے اندر کی عورت کہیں سے بول پڑی۔ میرے منع کرنے کے باوجود بول پڑی۔ اتنے برس ہو گئے تھے ہم دونوں کی شادی کو، پیار کا لفظ کسی ناکردہ گناہ کی طرح، ہمارے بیچ کبھی نہ آیا تھا، کبھی کسی کی زبان سے ادا نہ ہوا تھا۔ پیار تو کرتے ہیں، بولتے نہیں ہیں۔ پیار تو لہو پیتا ہے، اور

''بیس برسوں میں جو لفظ میری زبان پر نہ آیا تھا، وہ کیوں آج کلمۂ شکایت بن گیا۔ میں نے اپنی زبان دانتوں تلے داب لی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا! لفظ تو زبان سے نکل چکا تھا، اور تیر کی طرح چل چکا تھا۔

''اگر تیر چل کر کہیں الجھ گیا تو بھی انھوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ایک لمحے کے لیے ان کا منہ کھلا، ایک لمحے کے لیے چہرے پر غصّے کا ایک رنگ آیا... دوسرے ہی لمحے میں انھوں نے جھک کر مجھ سے کہا... بڑی نرمی سے، آج تم میری شیو بنا دو۔''

''وہ صوفے پر لیٹ گئے، آنکھیں بند کر لیں، میں شیو بنانے لگی۔ یہ ان کا

طریقہ تھا، جب وہ مجھ سے گہری قربت ظاہر کرنا چاہتے تو شیو بنانے کے لیے کہتے۔''

''مگر آج تو نہ صرف یہ کہ میں نے ان کی شیو بنائی، بلکہ ان کے کپڑے بھی بدل دیے، خود نہلایا، تولیے سے بدن پونچھا، نئے کپڑے پہنائے، اور کسی بچّے کی طرح بستر پر لٹا دیا۔ انھوں نے بھی ایک بچے کی طرح لاڈ کرتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھا دیے، اور مجھے اپنی آغوش میں لے لیا، اور آنکھیں بند کر کے اپنا گال میرے گال سے لگا دیا۔

'''تم مجھ سے پیار کرتے وقت اپنی آنکھیں بند کیوں کر لیتے ہو؟' میں نے پوچھا۔

''ان کا سارا بدن ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گیا، پتھر کی طرح جامد ہو گیا، پھر ہولے سے حرکت کی رَوان کے جسم میں دوڑنے لگی۔ وہ آنکھیں بند کیے میری ٹھوڑی چوم کر بولے، 'میں آنکھیں بند کر کے تمھیں زیادہ اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔''

'یہ بھی جھوٹ ہے۔' میرے دل نے کہا، 'تم زیادہ اچھی طرح کسے دیکھ سکتے ہو؟ کیا مجھے؟ یا کسی اور کو؟ یہ 'زیادہ اچھی طرح' بہت ہی ذو معنی ہے، یعنی کب میں تمھیں زیادہ اچھی طرح دکھائی دیتی ہوں؟ یا تم کسی اور کو، جو مجھ سے زیادہ اچھی ہے، دیکھتے ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم حقیقت سے آنکھیں بند کر کے کسی خواب میں گُم ہو جانے کی کوشش کرتے ہو۔ برسوں سے کرتے آئے ہو، یعنی میرے گالوں کے لمس میں کسی اور کے رخساروں کا لمس ڈھونڈتے ہو۔ آنکھیں بند کر کے میرے ہونٹ چومتے

ہو، اور اِن ہونٹوں میں کسی اور کے بوسے تلاش کرتے ہو۔ جسم میرا ہو اور روح اُرملا کی ، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جی چاہتا ہے تم سے یہ سوال پوچھ لوں۔ کیا میری بیس برس کی پرستش نے تمہارے دل کا کوئی داغ مندمل نہیں کیا؟ کتنے ہی سوال آتے ہیں میرے دل میں، جنھیں میں پوچھنا چاہتی ہوں، مگر پوچھ نہیں سکتی، کیوں کہ تمہارے اور میرے درمیان یہی ذومعنویت تو برسوں سے پختہ ہو رہی ہے، اور زندگی کے اِس بحرِ بے کراں میں جھوٹ کی بھی تو ایک نازک پتوار ہے، جس سے ہماری شادی شدہ زندگی چل رہی ہے۔ اس پتوار کو بھی توڑ دوں، پھر کیا ہوگا؟.....''

''اِس لیے میں نے بات کا رخ ہی پلٹ دیا، پوچھا، تمھارا تجربہ کامیاب رہا؟...

''ابھی آزما کر نہیں دیکھا۔''

''کب آزماؤ گے؟''

''دو ایک دن میں۔''

''کس طرح کا تجربہ ہے؟ میرا مطلب ہے، کیا تمھیں کیمیا گری کا شوق ہوا ہے؟ سنتے ہیں، تمھارے دادا کو بھی شوق تھا۔ وہ سونا بنانے کا نسخہ دریافت کرتے رہے، اور اسی شوق میں لاکھوں گنوا دیے۔ کیا تم بھی مٹی سے سونا بنانا چاہتے ہو؟''

''نہیں...' اُنھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا، 'میں سونے کو مٹی میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ کیا حماقت ہے؟ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''بات میری سمجھ میں بھی فی الحال نہیں آئی ہے، اِس لیے میں زیادہ تشریح کیا کروں!''

''سونے کو مٹی میں تبدیل کرنا! بھلا ایسی کیمیا گری میں کیا فائدہ ہے؟''

''فائدہ تو میں دیکھتا ہی نہیں۔' وہ بڑے پُراسرار لہجے میں بولے، 'میں تو اب یہ دیکھتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ نقصان کس میں ہے؟''

''الٹی سیدھی باتیں مت کرو۔' میں پیار سے انھیں تھپک کر بولی، 'اب سو جاؤ، تمہاری آنکھوں میں کئی راتوں کی نیند بھری ہے۔''

''تھوڑی دیر میں مجھے ان کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آئی، پھر میں بھی انھیں تھپکتے تھپکتے سو گئی۔''

''رات گئے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو بستر خالی تھا۔ اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھا، باتھ روم دیکھا، کہیں نظر نہ آئے گھبرا کر خواب گاہ کے باہر نکلی، پہرے دارنیوں سے پوچھا۔ اُنھوں نے بتایا۔' سرکار اوپر ٹاور میں گئے ہیں۔''

''اِس گہری اندھیری رات میں اوپر ٹاور جانے کا کیا مطلب؟ کیا ہو رہا ہے اوپر وہاں؟''

''کیا اس کیمیا گری کی آڑ میں انھوں نے کوئی دوسری عورت تو نہیں رکھ لی؟...اوپر ٹاور میں؟...عجیب احمق تھی میں جو اب تک ان پر اعتبار کرتی رہی، اسے

معمولی بات سمجھ کے ٹالتی گئی، مجھے معلوم کرنا ہی ہوگا۔''

''میں ٹاور کیطرف بڑھنے لگی۔ دو پہرے دارنیوں نے میرا ساتھ دینا چاہا، میں نے جھڑک کر انھیں منع کر دیا، اور اکیلی ہی موی شمع ہاتھ میں لے کر چلی۔

''کئی کمرے، دالان، غلام گردشیں میرے قدموں کی چاپ سے گونجتی گئیں۔ رات کے سناٹے میں اپنے قدموں کی چاپ بھی عجیب معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی دوسرا چل رہا ہو، یا آپ کے قدم سے قدم ملائے آپ کے پیچھے پیچھے آ رہا ہو۔ ٹاور چوتھی منزل پر واقع ہے۔، اور گڑھی کا سب سے اونچا، سب سے دشوار گزار، اور سب سے تاریک حصہ ہے۔ ایسا ہَولناک سناٹا ہے یہاں کہ دن میں جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ پہلی تین منزلوں کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے دم پھول گیا۔ یہاں میں کچھ دیر کیلئے چوتھی غلام گردش میں رُکی، اور ہاتھ میں شمع دان لیے کئی منٹ کھڑی رہی۔ یہاں آ کر سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا تھا، جیسے سارا قلعہ دم روکے کھڑا ہو، میرے سامنے ٹاور کا آہنی دروازہ تھا، جس کے اندر چکر کھاتا ہوا، گھومتا ہوا، بلند ہوتا ہوا پتھر کا ایک زینہ تھا۔ زینے سے ہٹ کے ٹاور کی گول دیواروں میں جگہ جگہ سوراخ بھی ہیں اور ان میں پرانی وضع کی توپیں نصب ہیں، اور جہاں جہاں توپیں نصب ہیں وہاں زینہ تنگ کر دیا گیا ہے۔ اور توپوں کے لیے حاشیے میں جگہ چھوڑ دی گئی ہے۔

''ٹاور کا دروازہ اَدھ کھلا تھا، میں نے دھیرے سے اُسے کھول کر اندر جھانکا، گھپ اندھیرا تھا۔ جہاں پر صرف توپ کا دہانہ باہر نکالنے کے لیے دیوار میں سوراخ

تھا۔ وہاں سے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا تھا، جس کی تاریکی میں تین چار تارے لرز رہے تھے۔

''دروازہ بے آواز کھلا، میں اندر چلی گئی، چند لمحوں تک ٹھٹکی کھڑی رہی، پھر حواس مجتمع کر کے چکر لگاتی ہوئی سیڑھیوں پر اوپر چڑھنے لگی۔ بہت آہستہ آہستہ، بے آواز قدموں سے موی شمع کی روشنی زینے کے سینکڑوں برس پرانے پتھروں پر پڑ رہی تھی، جن کا رنگ کسی زمانے میں نیلا ہوگا، مگر اب سیاہی مائل ہو چکا تھا، ہَوا کی رُکی سی تھی، اور فضا میں ایک عجیب سیلن، بدبو اور گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ گول زینے پر چڑھتے ہوئے ایک اور عجیب احساس ہوتا ہے۔ چوں کہ ہر چند گز کے فاصلے پر آگے آنے والی سیڑھیاں نظر سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اس لیے ہر چند گز کے فاصلے پر ایک نئے خطرے کا احساس ہوتا ہے، جو رات کی تاریکی میں رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ میں، جو جنگل کی گھٹا ٹوپ تاریکی سے نہیں گھبراتی، اُس وقت، اُس اجنبی سے میں، اُس ٹاور پر چڑھتے ہوئے ایک عجیب سا خطرہ محسوس کر رہی تھی، پھر بھی میں نے جی کڑا کیا، اور ہمت کر کے اوپر چڑھتی گئی، آگے بڑھتی گئی۔ کہیں کہیں پر رُک کر جلتی ہوئی شمع کو اپنے آنچل کی آڑ میں چھپا کر اوپر چڑھنے لگتی۔ باہر کی زوردار ہوا اُن سوراخوں سے، جہاں توپوں کے دہانے رکھے ہوئے تھے، ٹکرا ٹکرا کر عجیب سی آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ ہُو ہُو ہُو..... جیسے جنگل کی بدروحیں یا ٹاور کے بھوت پریت مجھ پر ہنس رہے ہوں، مگر کچھ بھی ہو جائے، مجھے تو اب آگے جانا ہی ہے، اور اوپر ٹاور کے کمرے میں پہنچ کر یہ دیکھنا ہے

کہ وہ رات گئے اکیلے اس ٹاور کے کمرے میں کیا کر رہے ہیں؟ زینے کا آخری چکر اب میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ اونچی جاتی ہوئی کوئی پچیس سیڑھیوں کے اوپر ٹاور کا وہ کمرا تھا، جس کے اوپر تانبے کا ایک تبتی وضع کا فانوس لٹکا ہوا تھا، جس کی کمزور پیلی روشنی ، سیڑھیوں کی تاریکی میں ایک زرد ہالہ سا بنا رہی تھی، جو فضا میں لرزتا ہوا محسوس ہوتا تھا؛ چاروں طرف تاریکی اور بیچ میں روشنی کا زرد، کم زور سا ہالہ تاریکی کے سمندر میں ایک کمزور کشتی کی طرح لرزتا ہوا۔

''یہاں میں دم لینے کے لیے رکی۔ ٹاور کا چوبی دروازہ اندر سے بند تھا۔ سیڑھیوں پر کوئی نہیں تھا، فانوس کی زرد، پیلی سی روشنی سناٹے کی ہیبت میں اضافہ کر رہی تھی۔

میں نے شمع دان زینے کی ایک سیڑھی پر رکھ دیا، اور دوسری سیڑھی پر خود بیٹھ کر کپڑے ٹھیک کرنے لگی، پھر اپنے بال ٹھیک کیے، پھر شمع دان اٹھانے کو ہاتھ جو بڑھایا تو ہوا کا ایک تیز جھونکا کہیں سے آیا، اور شمع دان میرے ہاتھوں میں گُل ہو گیا، تاریکی اور بھی گہری ہو گئی۔

''پھر نہایت ہولے ہولے اوپر ٹاور کا دروازہ کھلنے لگا، دھیرے دھیرے کھلتا گیا، اور ایک عورت نمودار ہوئی، جسے دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور میں اُن سیڑھیوں پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی..... یہ اُرملا تھی۔

''خوف اور دہشت سے میرے چیخ نکلنے کو تھی کہ جلدی سے میں نے اپنے مُنہ

پر ہاتھ رکھ لیا۔ یہ اُرملا تھی۔ ہُو بہو اُرملا؛ وہی چہرہ، وہی مسکراہٹ، وہی کپڑے، وہی قد و قامت.....

وہ ٹاور کے دروازے میں کھڑی تھی، اور مسکرا رہی تھی، اور اُس کے کھلے بالوں میں تبتی فانوس کی روشنی چمک رہی تھی۔ روشنی بہت کمزور تھی، مگر میں نے اُسے پہچان لیا۔

''جیسے میرے پاؤں سیڑھیوں میں گڑ گئے تھے، پتھر کے فرش کا ایک حصہ بن گئے تھے، میرا سارا جسم سُن ہو گیا تھا، جامد و ساکت..... دل کی حرکت بھی جیسے بند ہو گئی ہو۔ میں بس اُسے تکے جا رہی تھی، مگر اپنی جگہ سے ہل نہ سکتی تھی۔

''پھر جیسے اُرملا نے مجھے دیکھ لیا، اور مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف بڑھنے لگی، سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک عجیب تضحیک آمیز مسکراہٹ تھی۔ وہ ٹاور کی گنبد نما تاریکی میں دھیرے دھیرے اترتی ہوئی، گویا تاریکی میں تیرتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ ہولے ہولے اُس کا وہ تضحیک آمیز تبسّم والا چہرہ میرے قریب آتا جاتا تھا۔ خوف اور دہشت سے میں نے چیخ مارنی چاہی، مگر میری طاقت گویائی جواب دے گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میرے زبان تالو سے چپک گئی ہے۔ میں نے اٹھ کر بھاگنا چاہا، مگر میرے قدم وہیں گڑے کے گڑے رہ گئے۔ اُس کا چہرہ میرے قریب آتا گیا۔ یکا یک سارا زینہ میرے گرد چکّر کھانے لگا اور 'ہُو ہُو' کر کے لاکھوں چمگادڑیں میرے ذہن میں شور مچانے لگیں، پھر وہ چہرہ یکا یک تاریکی میں گھُل گیا، پھر

مجھے یاد نہیں، کیا ہوا۔ شاید میں اُس خوف اور دہشت سے اُن سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہوگئی تھی۔

''جب ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر تھی، اور وہ گہری سنجیدگی اور انہماک سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کے اُنہوں نے سکون کا ایک سانس لیا، اور پیچھے ہٹ کر میرے بستر کے قریب ایک آرام کرسی پر دراز ہوگئے، اُنہوں نے ایک ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا، جس سے میں اُن کی آنکھیں نہ دیکھ سکتی تھی۔

''کچھ عرصے بعد جب میں بولنے کے قابل ہوئی تو میں نے پوچھا، 'وہ اُرملا تھی نا؟.....

''وہ سر ہلا کر بولے، 'نہیں..... وہ لکڑی کا ایک پتلا تھا۔''

''لکڑی کا پُتلا؟.....''

''ہاں..... میں تم سے ایک نئے تجربے کی بات نہیں کر رہا تھا! سو وہ تجربہ وہی تھا۔ میں اوپر ٹاور میں شمبھو دادا سے لکڑی کے قد آدم پُتلے تیار کروا رہا ہوں۔ سوچا تھا، رام نومی پر ان پُتلیوں کی مدد سے رامائن کا ڈراما کھیلوں گا، نئی چیز ہوگی، اور ہمارے علاقے کے لیے بہترین۔ یہاں نہ تو تھیٹر ہے، نہ سینما..... بے چارے غریب لوگوں کی تفریح کا کوئی سامان ہی نہیں ہے۔ پُتلیوں کے کھیل ہیں، لیکن پرانی وضع کے۔ میں نے سوچا، شمبھو دادا کی مدد سے نئے پُتلے بنوا کر نئے ملبوس اور نئے ساز و سامان سے ایک نیا کھیل کھیلا جائے۔ میں تم سے یہ تجربہ اِس لیے راز میں رکھ رہا تھا کہ میں رام نومی کے

موقع پر اچانک تمہیں یہ کھیل دکھا کر مبہوت کر دیتا، مگر تم وقت سے پہلے آگئیں، رامائن کی گڑیا کتھا دیکھنے سے پہلے.....''

''مگر..... مگر.....' میں نے کہا، 'اُس پتلے کی شکل تو ہُو بہو..... ہُو بہو اُرملا سے ملتی ہے!..... ہے نا؟''

''ہاں ٹھیک ہے..... وہ پُتلا لکشمن کی بیوی کا تھا، جس نے اپنے پتی کے بچھڑنے پر چودہ سال ایک برہمن کا بن باس کاٹا..... یاد ہے!' کنور جی نے غور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''

''میرا خیال ہے، اُن کا تجربہ کامیاب رہا۔' میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر گھوش!'' رانی جی اپنی بے چین انگلیاں جلدی جلدی ایک دوسرے میں گڈمڈ کرتی ہوئی بولیں، میرا خیال ہے، رامائن کی گڑیا کتھا کا تو ایک بہانہ تھا، وہ اِس کھیل میں اُرملا، میری بہن کی شکل کی ایک قد آدم گڑیا بنا کے میرا امتحان لینا چاہتا تھا۔ شاید وہ مجھے ساری پبلک میں بے نقاب کرنا چاہتا تھا..... یہ ٹھیک سے میں نہیں جانتی کہ وہ کیا کرنا چاہتا تھا، مگر اِتنا ضرور جانتی ہوں کہ جب اُس دن وہ اُرملا کے اس قد آدم پُتلے کے پیچھے چھپا ہوا اُسے سیڑھیوں سے نیچے اتار رہا تھا، اُس وقت مجھے دیکھ کر اپنے تجربے کی آزمائش کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ وہ اچھا موقع تھا اُس کے لیے، اور اِس سے اُس نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اچانک، مجھے خبردار کیے بغیر اُس نے اس پُتلے کے ذریعے وہ گہرا احساس جرم میری آنکھوں میں پڑھ لیا، جو اَب تک اُس کی نگاہوں سے

اوجھل تھا۔''

''رانی جی کی آنکھوں میں اُس وقت تاسّف کی ایک گہری اداسی تھی۔''

''پھر کیا وہ 'رامائن' کی گڑیا کتھا کا کھیل کھیلا گیا؟.....''

''نہیں..... میں نے کینسل کرا دیا۔ وہ کھیل تو ایک طرح سے کھیلا جا چکا تھا۔''

''اور اُرملا کی وہ گڑیا؟.....''

''اُسے میں نے جلوا دیا۔''

''جلوا دیا؟.....''

''ہاں، یہ کہہ کر جلوایا کہ چوں کہ میری بہن کی لاش نہیں ملی تھی، اس لیے اُسے جلایا بھی نہ جا سکا تھا۔ اُس کی بھٹکی ہوئی روح کو شانتی دینے کے لیے میں نے صندل کی لکڑی کا یہ پُتلا بنوایا ہے، اور اب اُسے اُرملا کی برسی کے روز باقاعدہ ارتھی اٹھا کر شمشان گھاٹ میں جلایا جائے گا۔ میرا یہ فیصلہ پبلک نے بہت پسند کیا۔ ارتھی کے ساتھ ساتھ کنور راج بھی گئے تھے، مگر عجیب بات یہ تھی کہ اُس روز شمشان گھاٹ جاتے ہوئے ، اُس ارتھی کے ساتھ ساتھ جاتے ہوئے اُنھوں نے کسی خاص غم کا اظہار نہیں کیا؛ نہ تو ارتھی اٹھاتے وقت، نہ شمشان گھاٹ میں جلاتے وقت۔ واپس آ کر ہم لوگ دستور کے مطابق کچھ دیر اُسی ٹنگ کے پیڑ کے نیچے ٹہلتے رہے جس کے قریب کے سنگِ مرمر کے چبوترے سے گر کر اُرملا کی جان گئی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے یکا یک انہوں نے مجھ سے پوچھا، 'جب اُرملا گری تھی، تم اُس

وقت کہاں کھڑی تھیں؟''

''میں چونک گئی، آج تک انہوں نے مجھ سے یہ سوال نہیں پوچھا تھا، بلکہ آج تک اِس واقعے پر کبھی کوئی گفتگو میرے اور اُن کے درمیان نہیں ہوئی تھی۔ میں دیر تک اُن کی طرف دیکھتی رہی، پھر بڑی مضبوطی سے اپنی جگہ سے چل کہ سنگِ مرمر کے اُس چبوترے کے پاس کھڑی ہوگئی، جہاں میں اُس رات کھڑی تھی، جس رات اُرملا کی شادی کنور راج سے ہونے والی تھی۔''

''یہاں!'' میں نے چبوترے کے قریب کھڑے ہو کر بتایا۔

''اور اُرملا کہاں تھی؟'' انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''میں نے چبوترے پر ہاتھ رکھ کر کہا، 'یہاں!''

''یہاں کہاں؟ ٹھیک جگہ پر کھڑی ہو کر بتاؤ۔''

''میں چبوترے پر بے خوف اور بے دھڑک چڑھ گئی، اور اُس جگہ پر کھڑی ہو گئی، جہاں اُرملا کھڑی تھی۔

''اور وہ انگور کے خوشے کہاں تھے؟ انہوں نے پوچھا۔''

''یہاں! میں نے اپنے سر کے اوپر ہاتھ ہلاتے ہوئے بتایا۔''

''توڑ کے بتاؤ؟''

''میں نے انگور کا ایک خوشہ توڑ کر ہاتھ میں جھلایا۔ وہ کچھ مایوس ہو گئے، جیسے انہوں نے کوئی چال سوچی تھی، اور وہ کارگر نہیں ہو رہی تھی۔ چند لمحوں تک وہ چپ

رہے، پھر یکایک بولے، 'تم یہیں کھڑی رہو میں ابھی آتا ہوں۔''

''مجھے کچھ عجیب سا لگا، مگر میں کھڑی رہی، وہیں چبوترے پر انگور کا خوشہ ہاتھ میں جھلاتے ہوئے۔ تھوڑی دیر اندر سے باہر آگئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی، میں بھونچکی رہ گئی۔ یکا یک لہو زور سے میری رگوں میں اچھلا، پرتھم سا گیا، پھر دل مندو جزر میں ڈوبنے لگا۔

''اُس نے میری طرف نشانہ لے کر کہا، 'اسی طرح کھڑی رہو ہاتھ میں انگور کا یہ خوشہ لے کے، مطلق نہ ہلنا...... میں تمہیں تنبیہہ کرتا ہوں، ذرا بھی نہ ہلنا۔''

''گھبراؤ مت! میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ پہلے ہی فائر میں انگور کا یہ خوشہ تمہارے ہاتھ سے جھٹک کر نیچے کھڈ میں گر جائے گا۔''

کنور نے شست باندھی، میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اب سب کچھ جانتا ہے، مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے اور اُس نے مجھے سزا دینے کے لیے یہ چال چلی ہے، مگر میں نہتی تھی۔ دور نزدیک کوئی خادم بھی موجود نہ تھا، اور کنور کے پاس رائفل تھی۔ بھاگنے سے بھی کیا فائدہ! مجھے وہ زندہ نہ چھوڑے گا۔ رائفل کی نال اب [illegible] تنی تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

''یکا یک زور کا فائر ہوا، انگور کا خوشہ میرے ہاتھ سے گر کر دور نیچے کھڈ میں کہیں بکھر گیا۔ میں چبوترے پر صحیح سلامت کھڑی تھی۔''

''دیکھا میرا نشانہ!'' کنور جی نے رائفل چھوڑ کر تالی بجائی، اور مسکرا کر

دونوں ہاتھوں سے مجھے چبوترے سے اتار لیا۔

دوسرے سال بھی اُس نے ایسا ہی کیا۔ تیسرے سال کی برسی پر بھی یہی ہوا اور اگلے پانچ سال تک یہی ہوتا رہا، وہ مجھے چبوترے پر چڑھا دیتے، انگور کا خوشہ میرے ہاتھ سے گر جاتا۔ میں صحیح سلامت کھڑی رہ جاتی۔ یہ سب کچھ تو ہوتا تھا، مگر اُن لمحوں میں مَیں جس جہنم سے گزرتی تھی، اُس کا اندازہ کچھ مجھے ہی تھا۔ شست باندھتے وقت کنور جی کی آنکھیں گویا کسی اندرونی شیطنت سے ابلنے لگتی تھیں۔ میں اُن آنکھوں کی چمک، غصے اور انتقام کی تاب نہ لاسکتی تھی، مگر مجھے اس کھیل میں بھی ہارنا نہیں تھا۔ کیا وہ مجھے اس بات کی دعوت دے رہا تھا کہ جب وہ رائفل لینے اندر جاتا ہے، اور جب وہ رائفل لے کر واپس آتا ہے تو کیا اس بیچ کے عرصے میں مَیں خود اپنے احساسِ جرم سے متاثر ہو کر نیچے کھڈ میں چھلانگ لگا دوں گی؟ یا جب وہ مجھے اس کھیل کے ختم ہو جانے کے بعد وہ چبوترے سے اتارتے ہوئے اپنی بانہوں میں لے گا، میں اُسے کانپتے ہوئے، ڈرتے ہوئے، سسکتے ہوئے ملوں گی؟ یا اس بیچ کے عرصے میں وہ مجھے اترا ہوا پائے گا؟ ایسا تو کبھی ہو نہیں سکتا۔ ہر بار میں نے اُسے مایوس کیا، ہر سال مایوس کیا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ ہر سال وہ دن میرے لیے قیامت کا دن ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے ہر سال وہ اُس روز اُس قتل کا مجھ سے بدلہ لیتا ہے۔ ایسی طنزیہ مسکراہٹ ہوتی تھی اُس وقت اُس کی چہرے پر کہ میرا جی چاہتا تھا، اُس کا منہ نوچ لوں، مگر میں کچھ نہ کر سکتی تھی، کیوں کہ ہر کھیل کے اپنے آداب ہوتے ہیں، اور ہم لوگ، جو حکومت کرتے ہیں، کھیل

کے آداب نہیں توڑ سکتے۔

چھٹے سال میں نے کنور جی سے کہا، ''آج آپ وہاں کھڑے رہیے، جہاں اُرملا کھڑی تھی، جہاں پانچ برسوں سے میں کھڑی ہو رہی ہوں..... اُسی جگہ، اُسی طرح ہاتھ میں انگوروں کا خوشہ لے کر!''

''وہ کیوں؟''

''میرا نشانہ بھی دیکھئے، بے خطا ہے۔''

چند لمحوں تک وہ مجھے بڑے غور سے دیکھتے رہے، ایک عجیب سی مسکراہٹ اُن کے چہرے پر آئی، پھر وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر چبوترے کی طرف بڑھ گئے۔ ایک لمحے کے لیے اُن کا ہاتھ اُسی جگہ پر رُکا، جہاں اُرملا کے قدم رُکے تھے، پھر وہ ہاتھ اُن کے ماتھے تک گیا، جیسے انہوں نے برسوں سے بچھڑی ہوئی قدموں کی مٹی اپنے ماتھے سے لگالی ہو، پھر وہ اُرملا کی جگہ کھڑے ہو گئے، ہاتھ بڑھا کر انہوں نے انگور کی بیل سے اودے انگوروں کا ایک خوشہ توڑ لیا، اور اُسے جھلاتے ہوئے بولے، ''لائیے، آپ کا نشانہ بھی دیکھیں!''

''میں اندر گئی، اپنی رائفل لے کر آئی، شست باندھی، وہ بڑا سا انگوروں کا خوشہ ہاتھ میں لٹکائے اُرملا کی جگہ کھڑے تھے۔ میں نے شست باندھ کر گولی چلائی، گولی اُن کے سینے کے پار ہو گئی، چشم زدن میں اُن کا جسم دور نیچے ہزاروں فٹ گہرے کھڈ میں لڑھکتا اتا ہوا گرتا چلا گیا، اور بان گنگا کی شوریدہ لہروں میں گم ہو گیا۔''

رانی جی چپ چاپ تکیوں کے سہارے بستر پر بیٹھی ہوئی اپنی رنگین دُلائی کے کنارے سے کھیل رہی تھیں۔

میں نے کہا، ''اخباروں میں میں نے اس کا ذکر پڑھا تھا۔ غالباً برطانوی حکومت نے آپ پر مقدمہ بھی چلایا تھا۔''

''ہاں! مگر میں بَری ہو گئی تھی..... میں نے دو کروڑ روپے کی رشوت دی تھی۔''

''کوئی کرنل تھے، جو آپ کے مقدمے کی تفتیش پر مقرر کیے گئے تھے۔''

''ہاں! کرنل ڈی وائیٹر اُن کا نام تھا۔ انہوں نے دو کروڑ روپے لے کر مجھے بری الذمہ قرار دیا۔''

وہ اپنی ریشمی دُلائی کے رنگین کناروں سے اپنی انگلیوں کے ناخن الجھا کر اُس کے تار نکالنے لگے۔ میں سگار سلگا کے دھوئیں کے مرغولے ہوا میں چھوڑنے لگا۔ اس خاموشی کے دوران خادمہ آئی، اور فانوس روشن کر گئی۔ پہاڑوں پر سورج بہت جلد ڈوبتا ہے، شام بہت گہری ہوتی ہے، سناٹا بہت جلد بڑھتا ہے۔ اُس وقت چاروں طرف سناٹا اس قدر بڑھ گیا تھا کہ مجھے اپنا دم رُکتا ہوا محسوس ہوا۔

میں نے پوچھا، ''آخر کار آپ نے راز افشا کر دینے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

وہ بولی، ''اپنی خوشی سے نہیں بتا رہی ہوں۔ کچھ عرصے سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر کسی کو نہیں بتاؤں گی تو شاید میرا دم رُک جائے گا، میرا سینہ پھٹ جائے گا، میں

پاگل ہو جاؤں گی، ذہنی توازن کھو بیٹھوں گی۔ بیٹھے بیٹھے مجھے چکر آنے لگتے ہیں، ساری دنیا مجھے گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اور پھر چاروں طرف ایک گونج چکر لگاتی ہوئی، کسی بھیانک چمگادڑ کی طرح چیختی چلاتی ہوئی رات کو میرے اس قدر قریب آجاتی ہے کہ میں اپنے بستر سے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ میرا سارا جسم پسینے میں تر ہو جاتا ہے۔ یہ اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ مجھے ایسا لگا، جیسے اب مجھے کسی نہ کسی کو بتانا ہی پڑے گا، اور اگر نہیں بتاؤں گی تو میں آپ ہی یہ سب کچھ بک دوں گی، دیواروں سے کہہ دوں گی، خادموں سے کہہ دوں گی، تنگ کے پیڑ سے کہہ دوں گی، شاید چیختی چلاتی ہوئی عدالت میں جا کر سب کے سامنے کہہ دوں گی۔ اب تو کہنا ہی پڑے گا۔ شاید تم نے ٹھیک ہی کہا، قتل کی اپنی ایک شخصیت ہوتی ہے، قاتل اور مقتول کے علاوہ ..... اور وہ ایک سائے کی طرح پیچھا کرتی ہے، اور اُس وقت تک زندہ رہتی ہے، جب تلک سب کے سامنے اُس کی ہستی کا اعتراف نہ کرلیا جائے۔''

''مگر آپ نے اِس کام کے لیے مجھے کیوں چُنا؟''

''کیوں کہ دوسرے لوگ قتل میں ملوث ہو چکے ہیں، وہ جو مجھ پر شبہ کرتے ہیں، وہ جنہوں نے سنا ہے اور خاموش ہیں، وہ جنہوں نے خوشامد کی ہے، اور رشوت لی ہے، وہ جنہوں نے آنکھیں چرائی ہیں، اور جنہوں نے بھول جانا مناسب سمجھا..... وہ سب کسی نہ کسی طرح اِس قتل میں میرے ساجھے دار ہیں، اُن کو بتانے سے کیا حاصل! وہ تو اِس قتل کا بوجھ کسی نہ کسی صورت اپنے کندھوں پر لیے پھرتے ہیں، اُن کو بتا کر میں کیا

کروں گی! اِس لیے میں نے تمہارا انتخاب کیا۔''

''شکریہ!..... میں نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا، تو اب میں جاؤں؟''

اُس کی سانس پھول رہی تھی، چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، ایک رنگ جارہا تھا، اُس نے رُک رُک کر مجھ سے پوچھا، ''کیا وقت ہوا ہے؟''

''چھ بجنے میں دس منٹ ہیں..... کیا آپ اپنی خواب گاہ میں گھڑی نہیں رکھتیں؟''

''رکھی تھی، مگر میں نے اُسے ڈرائنگ روم میں منتقل کروا دیا ہے۔ ابھی چھ بجنے پر تم اُس کلاک کا گانگ ڈرائنگ روم سے سنو گے۔''

''کیا اس کلاک کا بھی اس داستان سے کوئی تعلق ہے؟''

''بالکل ہے، اور تمہیں منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آج میں اپنے قریب ایک ایسا آدمی چاہتی ہوں جو جدید تہذیب کا ہو، اور سائنس سے واقفیت رکھتا ہو۔ میں وہمی نہیں ہوں، میں پُراسرار اور مافوق الفطرت چیزوں پر اعتقاد نہیں رکھتی، مگر ادھر کچھ دنوں سے جو کچھ اس گڑھی میں ہو رہا ہے، وہ اس قدر عجیب، حیرت انگیز اور پُراسرار ہے کہ اُس کی کوئی توجیہہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم ایک ڈاکٹر ہو۔ ممکن ہے، تم اس کی کوئی ایسی تشریح کرسکو، جو اوہام سے پرے اور انسانی ذہن کے قریب ہو۔ گو میں سمجھتی ہوں کہ اب ایسا ناممکن ہے، پھر بھی میں تم پر بھروسا کرسکتی ہوں۔ ممکن ہے تم میرے بچاؤ کی کوئی صورت نکال سکو۔''

''بات کیا ہے؟''

''چند دنوں سے یہاں عجیب وغریب واقعات ہو رہے ہیں، شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ڈرائنگ روم میں، جہاں میری نظر کے سامنے کنور راج بہادر سنگھ کی تصویر لگی ہے، وہاں ہفتے بھر پہلے تک اُرملا کی تصویر لگی تھی، جسے میں ہر روز ہار پہنایا کرتی تھی۔ برسوں سے یہ میرا معمول تھا، اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی پھر جب کنور جی مر گئے تو میں نے اُن کی بھی ایک تصویر مخالف دیوار پر لگا دی، اور ہر روز اُسے بھی ہار پہنانے لگی۔''

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا..... اُس نے میری مسکراہٹ دیکھ لی، مگر کچھ کہا نہیں۔ اپنی داستان جاری رکھی۔

''اُرملا کی تصویر کے نیچے..... بہت نیچے ایک کارنس ہے، اُس کارنس پر وہ چھوٹی کیبنٹ سائز کی تصویریں، الگ الگ دو فریموں میں جُڑی رکھی ہیں، اور برسوں سے یہیں پڑی ہیں۔ ایک تصویر میری ہے، دوسری میرے شوہر کنور راج بہادر سنگھ کی..... دونوں تصویریں برسوں سے ساتھ ساتھ کارنس پر اکٹھی رکھی تھیں، اور اُن کے اوپر دیوار پر اُرملا کی بڑی تصویر تھی، چاندی کے فریم میں جُڑی ہوئی، جسے میں ہر روز ہار پہنایا کرتی تھی۔''

''آج سے سات روز پہلے ایک عجیب واقعہ ہوا۔ جب میں حسبِ معمول اُرملا کی تصویر کو ہار پہنانے گئی تو میں نے دیکھا کہ پرانا ہار اُرملا کی تصویر سے ٹوٹ کر نیچے کنور

جی کی تصویر کے گرد حمائل ہو چکا ہے، اسے بہت سی باندیوں نے بھی دیکھا، اور تعجب میں گھری رہ گئیں''۔

میں نے کہا، ''یہ محض ایک اتفاق ہو سکتا ہے۔ ہار کا دھاگا کمزور رہا ہوگا، ہوا کے کسی جھونکے سے، یا فریم کے دباؤ سے ٹوٹ کر نیچے گر پڑا۔ نیچے کنور جی کی تصویر تھی، اُس کے گرد حمائل ہو گیا..... سب بات سمجھ میں آتی ہے۔''

''پہلے دن کی بات کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ کوئی بھی اُسے اتفاق پر محمول کر لے گا، میں نے بھی یہی کیا، اور حسبِ معمول کسی تردّد، پریشانی، یا ہراس کا اظہار کیے بغیر وہ پرانا ہار اٹھوا کر پھنکوا دیا، اور نیا ہار اُرملا کی تصویر کے گرد چڑھا دیا، مگر دوسرے دن جب میں اُرملا کی تصویر کو ہار پہنانے گئی تو وہ ہار بھی ٹوٹ کر کنور جی کی تصویر کے گرد حمائل ہو چکا تھا۔''

رانی جی نے اتنا کہہ کر میری طرف غور سے دیکھا جیسے انہوں نے مجھے چت کر دیا ہو۔ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا، ''دوسرے دن کا واقعہ بھی ایک اتفاق ہو سکتا ہے یا..... کسی کی شرارت!''

''میں نے بھی ایسا سوچا تھا۔'' رانی جی نے کہا، اسی لیے میں نے اُسی دن اُرملا کی تصویر کو وہاں سے اتروا کر مخالف دیوار پر لگوا دیا جہاں کنور جی کی تصویر تھی، اور کنور جی کی تصویر کو وہاں لگا دیا، جہاں اُرملا کی تصویر تھی، یعنی جہاں پر اب وہ مجھے دکھائی دیتی ہے۔''

''پھر کیا ہوا؟'' کیا تیسرے دن بھی ہار ٹوٹ کر گرا''

''نہیں.....'' وہ بولی، ''مگر اُس دن ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ شام کے چھ بجے میں اس بستر پر اکیلی لیٹی تھی۔ پہلے میں نے اپنے خواب گاہ کے کلاک کے گانگ کی آواز سنی۔ وہ اُس دن تمہاری بائیں طرف کی دیوار پر لٹکا ہوا تھا۔ میں نے جب وقت دیکھنے کے لیے اُس پر نگاہ ڈالی تو مجھے وہ کلاک عجیب سا دکھائی دیا، اُس کا ڈائل ایسا لگا جیسے کسی خوفناک چیز کا چہرہ ہو اور اُس کی سوئیاں جیسے دو بڑے بازو ہوں، اور گھنٹوں کے حروف جیسے بہت بڑی بڑی آنکھیں، جو پٹ پٹ میری طرف سوالیہ انداز میں دیکھ رہی ہوں۔

''میں نے گھبرا کر کلاک سے نظریں ہٹا لیں تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے فضا کا سناٹا بہت بڑھ گیا ہے۔ خواب گاہ اور اُدھ کھلے ڈرائنگ روم کی روشنیاں ایک دم مدھم پڑ گئی ہیں، اور میں دور..... سب کی نظروں سے دور اِس کمرے میں اکیلی قید کر دی گئی ہوں، میرا دم گھٹنے سا لگا۔ میں نے یہ کمرا چھوڑ کے ڈرائنگ روم میں جانے کا قصد کیا تو یکا یک چیخ مار کے رہ گئی۔''

''میں نے دیکھا کہ جہاں کنور راج بہادر سنگھ کی تصویر لگی ہے، اُس دیوار پر ایک اور تصویر سرکتی چلی آ رہی ہے..... روشنیوں اور سایوں کی شطرنجی میں ایک تصویر بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ بڑھتے بڑھتے وہ تصویر کنور راج کی تصویر کے ساتھ لگ گئی۔ میں دھک سے رہ گئی، یہ اُرملا کی تصویر تھی۔ میرا دماغ چکر کھانے لگا۔ بڑی مشکل سے میں

نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر دیکھا، واقعی اُرملا کی تصویر تھی، جو مخالف دیوار سے ہٹ کر کسی پُراسرار طریقے سے چل کے اپنی پرانی جگہ پر آن پہنچی تھی۔ خوف اور دہشت سے میں نے آنکھیں بند کر لیں، پھر جب آنکھیں کھولیں تو وہ تصویر وہیں موجود تھی، اور اب میری طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھی، پھر میں نے دیکھا کہ اُرملا تصویر کے فریم کے اندر اپنی جگہ سے سرکنے لگی۔ سرکتے سرکتے وہ کنور راج کی تصویر کے فریم کے پاس پہنچ گئی۔ پھر جیسے فریم پگھل گیا اور وہ دونوں تصویریں ایک ہو گئیں۔ اب اُرملا میرے شوہر کے قریب کھڑی مسکرا رہی تھی، جو ہاتھ میں رائفل لیے کھڑے تھے۔ وہ بار بار ایک انگلی اٹھا کر میری طرف اشارہ کرتی تھی، اور اُنہیں اپنی رائفل اٹھانے کا مشورہ دیتی تھی، اور وہ مسکرا کر ایک ہاتھ اُس کی کمر میں ڈال کر انکار کرتے، اور اُسے پیار کرتے تھے۔ میں نے غصے میں آ کر آنکھیں بند کر لیں، اور لحاف اپنے اوپر اوڑھ لیا۔ چند منٹ بعد جو لحاف سے سر نکالا تو اُرملا اُسی طرح کنور راج کی بانہوں میں لپٹی ہوئی تھی، اور وہ دونوں میری طرف دیکھ کر ہنس رہے تھے۔''

''ایسا ہو نہیں سکتا۔'' میں نے سختی سے سر ہلا کر کہا، ''یہ سب آپ کی دماغی خلجان کا نتیجہ ہے، آپ اپنا ذہنی توازن کھو چکی ہیں۔''

''جو میں کہتی ہوں، وہ بالکل سچ ہے، اسی لیے میں نے تمہیں بلوایا ہے، آج تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ یہ کوئی ایک دن کا واقعہ نہیں ہے۔ پچھلے پانچ روز سے یہی ہو رہا ہے۔ اُسی طرح چھ بجتے ہیں، اُسی طرح تصویر چلتی ہے، کنور راج کی تصویر سے لگ

جاتی ہے، بیچ کا فریم ٹوٹ جاتا ہے، دونوں تصویریں ایک ہو جاتی ہیں، اُرملا میرے شوہر کو اشارے سے مجھ پر رائفل چلانے کے لیے کہتی ہے، وہ مسکرا کر انکار کرتے ہیں، دونوں مصروفِ اختلاط ہو جاتے ہیں، اور وہ کمبخت، وہ مردار اُرملا، میری آنکھوں کے سامنے مجھے جی جان سے جلاتی ہے۔ گزشتہ پانچ روز سے یہی ہو رہا ہے، اور آج ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بہت بڑی بات ہونے والی ہے، کیوں کہ آج اُرملا کی برسی ہے۔ آج رہ رہ کے میرا دل ڈوب رہا ہے۔''

یکا یک ڈرائنگ روم سے ایک خوفناک آواز آئی: ''ڈانگ!'' یہ ڈرائنگ روم کا کلاک تھا جو چھ بجا رہا تھا۔ خواب گاہ کے اندر چاروں طرف اُس کی بھاری گونج دار، وحشت ناک آواز گونج رہی تھی: ''ڈانگ.....ڈانگ.....ڈانگ.....!''

واقعی ایسا لگا، جیسے ہمارے چاروں طرف گہرا سناٹا ہو گیا ہو، جیسے ہمارے چاروں طرف خاموشی کا سمندر پھیل گیا ہو، اور ہم کسی سنسان کمرے میں اکیلے کھڑے ہوں۔ ایک لمحے کے لیے مجھے بھی ایسا لگا جیسے ڈرائنگ روم اور خواب گاہ کی بتیاں بہت مدھم پڑ گئی ہیں، روشنی گھٹ گئی ہے، تاریکی بڑھ گئی ہے۔

''ڈانگ!''

اُس گہرے سناٹے میں مَیں نے رانی جی کی طرف دیکھا، اُس کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی گہری سبز پتلیوں میں خوفناک وحشت نمایاں تھی۔ اُس کا سارا جسم، گویا تیز بخار کی حدّت میں کانپ رہا تھا۔

''ڈانگ!''

کلاک چھ بجا کر چپ ہو گیا، پھر ایسی خاموشی آئی جیسی قیامت سے پہلے آتی ہے۔ اُس سناٹے میں میری بانہوں کے بال کھڑے ہو گئے اور میرے سارے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ رانی کی آنکھیں گویا حلقوں سے باہر ابلی پڑ رہی ہیں۔ کسی خوفناک تاثر نے اُس کا چہرہ اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اور ایک ہاتھ اپنے گلے پر رکھے رُکتے ہوئے حلق سے وہ کہہ رہی ہے، ''وہ دیکھو.....وہ دیکھو.....تصویر آ رہی ہے!''

میں نے ایک لمحے کے لیے دور خواب گاہ کے دروازے سے پرے ڈرائنگ روم کی جھلملاتی روشنیوں اور سایوں میں دیکھنے کی کوشش کی، پھر میں مبہوت ہو کر رانی کا چہرہ دیکھنے لگا، جس کے خدوخال میری آنکھوں کے سامنے بگڑ رہے تھے۔ اُس کی گہری سبز پتلیوں میں کوئی خوفناک، غیر مرئی ہیولا ناچ رہا تھا، اُس کا دم رُک رہا تھا، اور وہ بڑی مشکل سے یہی کہہ رہی تھی، ''دیکھو.....وہ دونوں تصویریں ایک ساتھ ہو گئیں! اُرملا کنور راج کے پاس پہنچ گئی۔'' رانی جی کے ہونٹوں سے کف نکل رہا تھا۔

''وہ اُس رائفل اٹھانے کو کہہ رہی ہے!..... ہے رام.....اُس نے رائفل اٹھالی!''

میں یک لخت اپنی کرسی سے کھڑا ہوا، اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف جانے لگا۔ یکا یک پیچھے سے زور کی ایک چیخ سنائی دی، یہ رانی جی کی آواز تھی،

چیخ سن کر میں ڈرائنگ روم کی طرف جاتے جاتے پلٹ آیا، اور بھاگ کر رانی جی کے بستر کے پاس پہنچا۔

رانی جی کا جسم تکیوں سے نیچے اوندھا پڑا تھا۔ میں نے جلدی سے اُس کے جسم کو اٹھا کر جو سیدھا کیا تو میری نظر سیدھی اُس کی آنکھوں میں گئی، وہ گہری سبز پُتلیاں بے جان اور ساکت تھیں، چیتے کی آنکھیں مر چکی تھیں۔ جلدی سے میں نے نبض ٹٹولی، نبض غائب تھی۔ دل کی طرف نگاہ کی، رانی اپنا دل دونوں ہاتھوں سے یوں پکڑے تھی، جیسے گولی سیدھی اُس کے دل میں لگی ہے۔ میں نے دونوں ہاتھ ہٹا کے دل کی حرکت دیکھی، دل کی حرکت بند تھی، مگر گولی کا کہیں نشان نہ تھا۔

رانی جی کو وہیں بستر پر مردہ چھوڑ کر میں ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔ بھاگتا بھاگتا سیدھا ڈرائنگ روم کے وسط میں چلا گیا، اور گھوم کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ڈرائنگ روم میں کوئی نہ تھا۔ کنور جی اور اُرملا کی تصویریں الگ الگ دو مخالف دیواروں پر آمنے سامنے آویزاں تھیں، اور اپنی جگہ سے مطلق نہیں ہلی تھیں۔

☆.....☆.....☆